سبق آموز واقعات

مولانا وحید الدّین خاں

سبق آموز واقعات

مولانا وحید الدین خاں

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

First Published 1984
E-Published 2025

Sabaq Amoz Waqiyat
By Maulana Wahiduddin Khan

This book is copyright free.

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Mob. +91-9999944119
info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Center for Peace and Spirituality USA
391 Totten Pond Road,
Suite 402, Waltham MA 02451, USA
Mob. +1 617 960 7156
info@cpsusa.net

فہرست

تمہید 4
لکھنے کی دو قسمیں 6
ایک کو کیچڑ دکھائی دیا، دوسرے کو ستارے 8
مرداں چنیں کنند 9
قابلیت اور مستعدی 11
اپنے خلاف 13
بلند اخلاقی کی ایک مثال 14
اعتراف 16
ہمت کے ذریعہ 17
کام پر انعام 19
فرشتہ کا ٹیلیفون 20
آپ بیتی 22
خارجی ختم ہو گئے 24
خارجیت زندہ ہے 24
غلطی میری 25
تاریخ ساز بنئے 27
حوصلہ 28
ڈاکٹر تارا چند 30
حادثات ہیرو بنا دیتے ہیں 32
پہلے کچھ سہنا پڑتا ہے 33
خودنمائی کے شوق میں 35
جب آپ دلدل میں پھنس جائیں 37
قدردانی 38
اعتراف 40
غلطی کا اعتراف 40
ایسے زندہ انسان ہمارے اندر کیوں نہیں 41
اس کا ارادہ اس کی بیماری پر غالب آیا 42
درخواست کے بغیر 43
حکمت عملی 44
لڑائی ختم ہو گئی 45
کمزور طاقت ور کے اوپر غالب آسکتا ہے 46
فرد کا جھکنا قوم کا سربلند ہونا ہے 46
سیاست کا راز 48
کام میں انہماک 48
لطیفہ 49
وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے ہیں 50
توسع اور رواداری 51
رعایت نہیں صلاحیت 52
خاموشی اختیار کر لی 53
الفاظ جو فضا میں گم ہو گئے 53
دہرا نقصان 54
دو سو سال کے بعد 54
قومی کردار 55
ایک انسانی کمزوری 55
میں سوچ رہا ہوں 56
کرنے کا کام 57
یہ بے اعتمادی کی فضا 58
اور ہمارے عوامی حکمراں! 58
موت کے وقت توبہ 59
خدا کی طرف 60
کام کا صحیح طریقہ 60
کون کس کی جیب میں 61
کیسا عجیب 62
توہم پرستی کہاں تک لے جاتی ہے 63
خود را فضیحت دیگراں را نصیحت 63
آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی 64
ہر شعبہ میں کام کی ضرورت 65
ادبی استدلال 65
وہ صفحہ جو خالی رہا 66
اشتعال کے بغیر 68
یہ داستانیں 69
لطیفہ 70
استعمال کا فرق 71
لطیفہ 72
لطیفہ 73
زندہ لوگ 73
اس میں آپ کے لیے سبق ہے 74
چند واقعات 75
حقائق غالب آئے 78
اخباری شہنشاہ 79
انسان اور کچھوا 79
آسٹریلیا 80

تمہید

انسان کی زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ گویا تاریخ کی عملی کتاب کے اوراق ہیں۔ یہاں زندگی کی تمام حقیقتیں اپنے واقعاتی روپ میں متشکل ہورہی ہیں۔زندگی کی تلخیاں اورشیرینیاں، کردار کی پستیاں اور بلندیاں اور خارجی حقائق کے مقابلہ میں انسان کی رسائی اورنارسائی، سب یہاں کسی نہ کسی کی زندگی میں صورت پذیر ہورہی ہیں، سب کو تاریخ کے واقعاتی اسٹیج پر دیکھا جاسکتا ہے۔

تاہم دیکھنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی کے واقعات کو بس ایک سرسری تماشائی کی نظر سے دیکھا جائے۔ یہ دیکھنا گویا کیمرہ جیسا دیکھنا ہے، جو دیکھتا ہے مگر نصیحت نہیں لیتا۔ وہ دیکھنے کے بعد بھی کچھ نہیں پاتا۔

دوسرا دیکھنا یہ ہے کہ ان واقعات کو ''انسان'' کی نظر سے دیکھا جائے۔یعنی آدمی جو کچھ دیکھے ان پر وہ غور بھی کرے۔اس کی آنکھ نے جو کچھ پایا ہے، اس کو وہ اپنے دماغ سے بھی پانے کی کوشش کرے۔

بظاہر دونوں دیکھنا بالکل یکساں معلوم ہوتا ہے۔مگر حقیقت کے اعتبار سے ان میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ صرف دوسری قسم کے دیکھنے ہی کو دیکھنا کہا جاسکتا ہے۔پہلی قسم کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے نہ دیکھنا۔ انسان کے اندر اعلیٰ ترین صلاحیت فہم وبصیرت کی صلاحیت ہے۔آدمی جس چیز کو فہم وبصیرت کی سطح پر نہ پائے، اس کو انسان کا پانا نہیں کہا جاسکتا۔

انسان کی زندگی اپنی متنوع صورتوں کے ساتھ ہر قسم کے واقعات کا ریکارڈ ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں دوسرے انسان کے لیے سبق موجود ہے۔آدمی اگر آنکھ کھول کر دنیا میں رہے تو اپنے ہم جنسوں (fellow human being) کے واقعات میں وہ اتنی کافی

رہنمائی پالے کہ ہر قسم کے نشیب و فراز کو سمجھ کر زندگی گزارنا اس کے لیے ممکن ہوجائے۔ وہ ہر ٹھوکر سے دور رہے، وہ ہر پست حرکت سے اپنے آپ کو بچائے، وہ ہر نادانی میں پڑنے سے محفوظ رہے۔

مگر کوئی انسان اپنے گردوپیش کے واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ آدمی کسی حقیقت کو اس وقت تک نہیں مانتا جب تک اس کو ذاتی طور پر اس کا تجربہ نہ ہوجائے۔ مگر تجربہ وہی ہے جو دوسروں سے حاصل ہو، کیونکہ اپنا تجربہ تو ہمیشہ ہلاکت کی قیمت پر حاصل ہوتا ہے۔

انسانی واقعات سے نصیحت لینے کے لیے عبرت کی نگاہ درکار ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو ہر دور کے انسانوں میں سب سے کم پائی گئی ہے۔

وحیدالدین

16 اکتوبر 1981ء

لکھنے کی دو قسمیں

ایک بہت بڑے شاعر کو میں نے ایک بار دیکھا۔ وہ ایک غزل لکھ رہے تھے۔ غزل کا آخری لفظ تھا:

"انساں بنا دیا"۔ میں نے دیکھا کہ کاغذ کے کنارے انھوں نے بہت سے ہم وزن الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ مثلاً گلستاں، چمنستاں، زنداں، خموشاں، ویراں، بہاراں وغیرہ۔ ان الفاظ کو ذہن میں رکھ کر مضامین سوچتے ہیں، اور جب کوئی مضمون اس ردیف وقافیہ میں ڈھل جاتا ہے، تو اس کے بعد اسے کاغذ پر لکھ لیتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دو گھنٹے کے بعد وہ اس پوزیشن میں تھے کہ مشاعرہ میں یہ کہہ سکیں کہ: "تازہ غزل حاضر ہے"۔

میں نے بزرگ شاعر سے کہا: "آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔ آپ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کو تو نثر کی چیزیں لکھنی چاہئیں۔ اس قسم کی شاعری آپ کے شایانِ شان نہیں"۔ انھوں نے جواب دیا: "تم سچ کہتے ہو۔ مگر نثر میں لکھنے کے لیے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے، اور وہ مجھ سے ہوتی نہیں۔ اگر مطالعہ اور تحقیق کے بغیر نثر لکھوں تو ایک پارۂ ادب ضرور تیار ہو جائے گا۔ مگر ایسی کوئی کتاب نہیں بن سکتی جس کی آج کی دنیا میں قدر و قیمت ہو"۔

یہ شعر کی مثال تھی۔ اب دیکھیے کہ ایک "کتاب" کس طرح لکھی جاتی ہے۔

ایک امریکی لاری کولنس (Larry Collins, 1929-2005) اور فرانسیسی ڈامینیک لیپری (Dominique Lapierre, 1931-2022) نے مل کر ہندوستان کی آزادی پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے — "نصف شب کی آزادی":

Freedom of Midnight, 1975

اس کتاب کی تیاری میں ان کے چار سال سے زیادہ لگے ۔ انھوں نے لندن کے اخبار ٹائمس میں اشتہار دیا کہ جن لوگوں نے 47-1940 کے درمیان ہندستان میں کام کیا ہے، وہ اپنے پتے سے ہم کو مطلع کریں ۔ جواب میں ان کو دو ہزار خطوط ملے ۔ انھوں نے ان تمام لوگوں کے پاس اپنی ٹیم بھیج کر انٹرویو لیے اور رپورٹ تیار کی ۔ انھوں نے ہندستان، پاکستان اور برطانیہ کے تین سفر کیے اور مختلف جاننے والوں سے مل کر بارہ ہزار انٹرویو تیار کیے ۔ ان کی تحقیق اور دستاویزات اور انٹرویو کے کاغذات کا وزن ایک ٹن سے زیادہ تھا ۔ مگر ان کے فرانس کے دفتر میں ان کو اس طرح ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ ان کی خاتون سکریٹری "نسی" مخصوص کاغذ کو صرف ایک منٹ میں نکال سکتی تھی ۔

اب انھوں نے کتاب لکھنا شروع کی ۔ نصف حصہ کالنس نے انگریزی میں لکھا اور بقیہ نصف لیپری نے فرانسیسی میں ۔ ہر ایک دوسرے کے لکھے ہوئے کو دیکھتا، اور بے رحمانہ تنقید کرتا ۔ جب دونوں مطمئن ہو جاتے تو آخری مسودہ کو ایک مقامی کسان کی بیوی کو پڑھنے کے لیے دیتے ۔ اگر خاتون یہ کہتی کہ میں ٹھیک سے سمجھ نہ سکی تو وہ فرض کر لیتے کہ ابھی کچھ غلطی ہے اور اس حصہ کو دوبارہ لکھتے ۔ آخری ایک سال انھوں نے روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا اور اس طرح اپنی کتاب تیار کی ۔

مصنف نے یہ تفصیل بتاتے ہوئے انٹرویور سے کہا:

We lived like hermits, and we produced... 'Fredom at Midnight'

ہم نے رہبانوں کی طرح زندگی بسر کی اور پھر ہم نے اپنی کتاب تیار کرلی ۔

ایک کو کیچڑ دوسرے کو ستارے

ڈیل کارنیگی (1888-1955) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

How to stop worrying and Start Living, 1948

اس کتاب میں اس نے جنگ عظیم ثانی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

ٹامسن ایک امریکی فوجی تھا۔ اس کی ڈیوٹی کیلی فورنیا کے صحرائے موجاوی (Mojave) میں تھی۔ اس کی بیوی (Thelma Thompson, 1907-1977) اپنے شوہر سے قریب رہنے کے لیے وہاں گئی، اور قریب کی ایک بستی میں مکان لے کر رہنے لگی۔ تھوڑے دنوں رہنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ یہ جگہ اس کی پسند کے بالکل خلاف ہے۔ گرمی، ریت اور آندھی ہر وقت وہاں اس کا استقبال کرنے کے لیے موجود رہتے تھے۔ اس کے ساتھ تنہائی، کیوں کہ اس کے شوہر کا بیشتر وقت فوجی گشت میں گزرتا تھا۔ اس کے واحد ساتھی اس کے دیہاتی پڑوسی تھے۔ مگر وہ لوگ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، اس لیے وہ ان سے بھی مانوس نہ ہو سکی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دے اور اپنے گھر واپس چلی جائے۔ اس نے اپنے والدین کو ایک مایوسانہ خط لکھا، اور ان کو بتایا کہ وہ جلد ہی ان کے پاس لوٹ آنا چاہتی ہے۔ اس کے باپ کا جواب آیا۔ مگر وہ بہت مختصر تھا۔ باپ نے اپنے خط میں صرف دو سطریں لکھی تھیں:

Two men looked out from prison bars.
One saw the mud, the other saw the stars.

دو آدمیوں نے قید خانہ کے جنگلے سے باہر نظر ڈالی۔ ایک کو کیچڑ دکھائی دیا، دوسرے کو ستارے۔

ان دو سطروں نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی صحرائی گاؤں میں رہے گی، اور یہاں اپنے لیے بہتر زندگی بنائے گی۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاں کیچڑ ہے، وہیں اس کے اوپر ستارے بھی چمک رہے ہیں۔ اس نے ”کیچڑ“ کے بجائے ”ستاروں“ کو دیکھنے کی کوشش شروع کردی۔ اس نے مقامی لوگوں میں اپنے دوست بنائے۔ ان کا کلچر اور زبان سیکھی۔ اس نے صحرائی زندگی کی رنگا رنگیوں کو سمجھا۔ اس نے صحرا میں ڈوبتے اور نکلتے ہوئے سورج کے حسن کا مشاہدہ کیا۔ دھیرے دھیرے اس کو اس علاقہ سے اتنی دلچسپی ہوگئی کہ اس کا شوہر جب اپنی فوجی ملازمت سے ریٹائر ہوا تو دونوں نے طے کیا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی اسی مقام پر گزاریں گے، حتیٰ کہ اس نئے تجربہ نے مسز ٹامس کو ایک مصنف بنا دیا۔ اس نے اپنے تجربات کے متعلق ایک کتاب (Bright Ramparts, 1943) کے نام سے لکھی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس کے کثیر ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مصنف نے لکھا ہے:

The most improtant thing about suffering is not what happens to us but how we react to it

زیادہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ ہمیں کن مشکلوں سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلہ میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

مرداں چنیں کنند

لارڈ ٹامسن (1923-1976) کی پیدائش کناڈا میں ہوئی۔ انھوں نے اخبارات کو صنعت کی حیثیت سے شروع کیا اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ اب تک اخبارات کے کسی بھی دوسرے تاجر نے حاصل نہ کی تھی۔ کناڈا، برطانیہ، امریکا اور دوسرے ملکوں کے ایک سو سے زیادہ اخبارات ٹامسن ایمپائر کا حصہ تھے۔

ٹامسن بے حد شریف آدمی تھا۔ اخلاقی حیثیت سے کبھی اس سے کسی کو شکایت نہیں ہوئی۔ ایڈیٹروں کے انتخاب میں وہ انتہائی چھان بین کرتا تھا۔ مگر جب کسی شخص کو کسی اخبار کا ایڈیٹر مقرر کردیتا تو اس کو اپنے دائرۂ عمل میں مکمل آزادی دے دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے ایڈیٹروں کو یہ حق بھی تھا کہ وہ خود ٹامسن کے خلاف مضامین لکھ سکیں۔

ٹامسن کی سوانح عمری رسل بریڈن نے لکھی ہے جس کا نام ہے:

Roy Thomson of Fleet Street, 1965

سوانح نگار لکھتا ہے کہ ٹامسن کی واحد کمزوری یہ تھی کہ وہ "لارڈ" بننے کا بہت زیادہ حریص تھا۔ اس نے دیکھا کہ اپنے ملک کناڈا میں اس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔ کیوں کہ کناڈا نے لارڈ کا خطاب دینے کے برطانوی طریقے کو ختم کردیا تھا۔ چنانچہ ٹامسن نے برطانوی شہریت اختیار کرلی۔

اسے یقین تھا کہ برطانیہ آنے کے بعد وہ ضرور لارڈ بننے کا خواب پورا کر سکے گا۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ سامنے آ گئی۔ ہرولڈ میکملن کے بعد لارڈ ہوم برطانیہ کے وزیر اعظم (1963-64) مقرر ہوئے۔ ٹامسن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایڈیٹر اس وقت ڈینس ہملٹن تھے۔ انھیں اس تقرر پر اعتراض تھا۔ انھوں نے خاموش رہنے کے بجائے کھلم کھلا وزیر اعظم کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔

ٹامسن کے لیے یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ انھوں نے اپنے ایڈیٹر کو گفتگو کے ذریعہ قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوا تو انھوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ یہ کہہ کر معاملہ کو ختم کردیا:

What you say is your own province

یعنی یہ تمہارے اپنے دائرۂ کار کا معاملہ ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ جو کچھ لکھنا چاہتے ہو لکھو۔

برطانوی شہریت اختیار کرنے کے باوجود ٹامسن کے لیے اب بظاہر "لارڈ" بننے کا

امکان ختم ہو چکا تھا۔ ان کا اخبار برابر برطانوی وزیر اعظم پر تنقیدی مضامین شائع کر رہا تھا۔ مگر سر الیک ڈوگلاس ہوم (Alec Douglas-Home) نے بھی عالی ظرفی سے کام لیا۔ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے دل میں ٹامسن کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ اور ان کے لیے لارڈ کے اعزاز کی منظوری دے دی۔

یہی عالی ظرفی ہے، جو افراد اور قوموں کو ترقی کے اعلیٰ مقام کی طرف لے جاتی ہے۔

قابلیت اور مستعدی

راجہ مہندر پرتاپ (1886-1979) ہندستان کے ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے روس جا کر ولادیمیر لینن (1870-1924) سے ملاقات کی تھی۔ وہ 1919 میں آزادی پسندوں کے ایک وفد کے ساتھ لینن سے ملے تھے۔ وہ جب اشتراکی روس کے پہلے حکمراں کے کمرے میں داخل ہوئے تو لینن کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے ایک گوشہ سے وہ خود ہی ایک چھوٹی آرام کرسی اٹھا کر لایا۔ راجہ مہندر پرتاپ کہتے ہیں کہ میں آرام کرسی پر بیٹھا اور میرے ساتھ قریب کے ایک چھوٹے صوفہ پر لینن بیٹھ گیا۔ لینن کا پہلا جملہ یہ تھا:

In which language should I speak: English, German, French or Rassian.

میں کس زبان میں بولوں۔ انگریزی میں، جرمن میں، فرانسیسی میں یا روسی میں۔ بالآخر طے ہوا کہ انگریزی زبان میں گفتگو ہو۔ راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی ایک کتاب لینن کو پیش کی، اس کتاب کا نام تھا — پریم دھرم:

The Religion of Love

لینن نے کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہی فوراً کہا: ”میں اس کتاب کو پڑھ چکا ہوں“۔ راجہ

مہندر پرتاپ کہتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ لینن کو آخر یہ کتاب کہاں سے ملی۔ پوچھنے پر لینن نے بتایا کہ پچھلے دن شام کو جب آپ میرے سکریٹری سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے لیے ملے تھے تو آپ نے سکریٹری کو اس کتاب کا ایک نسخہ دیا تھا۔ سکریٹری نے آپ کا تعارف کرتے ہوئے یہ کتاب مجھے دکھائی۔ میں نے کتاب اس سے لے لی اور رات ہی کو اسے پڑھ ڈالا ”تاکہ کل صبح میں جس شخص سے ملنے والا ہوں، اس کے خیالات سے واقف ہو جاؤں“۔

لینن جدید روس کا بانی ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والا آدمی تھا۔ اوپر کے واقعہ سے اس کی دو خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک قابلیت، دوسرے مستعدی۔ اس نے تعلیم اور مطالعہ میں اتنی محنت کی تھی کہ وہ چار مختلف زبانیں جانتا تھا اور بیک وقت چاروں زبانوں میں گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کی مستعدی کا عالم یہ تھا کہ دنیا کا انتہائی مصروف حکمراں ہونے کے باوجود ایک غیر معروف ہندستانی کی کتاب اس نے راتوں رات محض اس لیے پڑھ ڈالی کہ کل کے دن وہ جس سے ملنے والا ہے، اس کے خیالات کا اس کو پیشگی اندازہ ہو جائے۔ اس نے اپنی فطری صلاحیتوں کو بھرپور طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کی اور اسی کے ساتھ عمل کے مواقع پر بھرپور عمل کیا، وہ دنیا کا ایک کامیاب لیڈر بن گیا۔

اسلام کی خدمت کا میدان ہو یا غیر اسلام کی خدمت کا، وہی لوگ دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں، جو ان دو خصوصیات کا ثبوت دیں۔ ایک طرف وہ وقت کے مطابق مکمل علمی قابلیت رکھتے ہوں، دوسرے وہ اپنی کارکردگی میں پوری طرح مستعدی کا ثبوت دیں۔ قابلیت اور مستعدی کے ان ضروری اوصاف کے بغیر نہ اسلام کا کوئی کام کیا جا سکتا ہے، اور نہ غیر اسلام کا۔

اپنے خلاف

1971ء میں آسٹریلیا کے وزیر اعظم اور پارلیمنٹری لبرل پارٹی کے صدر مسٹر جان گارٹن (John Grey Gorton, 1911-2002) تھے۔ پارٹی میں ان کے خلاف شکایت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد پارٹی کی پارلیمنٹری باڈی کی میٹنگ ہوئی جو قاعدہ کے مطابق انھیں کی صدارت میں تھی۔ میٹنگ میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش ہوئی۔ اس وقت حاضر ممبران 66 تھے۔ ووٹ جب لیے گئے تو دونوں طرف 33، 33 ووٹ پڑے۔ یعنی تحریک کے موافق اور مخالف دونوں برابر ہو گئے۔ اب فیصلہ صدر کے ایک زائد ووٹ سے ہونا تھا۔ صدر نے اپنا زائد ووٹ استعمال کیا۔ مگر خود اپنے خلاف۔ اس طرح انھوں نے خود اپنے ہی ووٹ سے شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ پارٹی کی صدارت سے علیحدہ ہو گئے اور کہا: جب ممبران کی اتنی بڑی تعداد صدر کے خلاف ہے تو صدر، صدر باقی رہنے کے قابل نہیں۔ (الجمعیۃ ویکلی، 20 جولائی 1973)

2۔ انیسوی صدی کے وسط کی بات ہے۔ پھلواری شریف (بہار) میں دو رئیس رہتے تھے۔ ایک کا نام قاضی غلام امام اور دوسرے کا قاضی مخدوم عالم تھا۔ دونوں رشتہ دار تھے۔ کسی وجہ سے دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی۔ مخدوم عالم سرکاری ملازمت میں تھے۔ اسی دوران ان کا تبادلہ دور کے مقام پر ہو گیا، جہاں سے پٹنہ کی عدالت میں تاریخوں پر حاضری سخت مشکل تھی۔ انھوں نے چاہا کہ اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے کسی کو مقرر کر دیں۔ کافی سوچنے کے بعد جب کوئی موزوں آدمی سمجھ میں نہ آیا تو وہ اپنے فریق مخالف قاضی غلام امام کے پاس گئے اور کہا کہ میں تبدیل ہو کر ایسی جگہ جا رہا ہوں کہ مقدمہ کی پیروی خود نہیں کر سکتا۔ یہ تمام کاغذات آپ کے حوالے ہیں۔ اب آپ ہی میری

طرف سے مقدمہ کو دیکھیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے قاضی غلام امام کو اپنے مقدمہ کے کاغذات دیے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

قاضی غلام امام کے لیے اس اعتماد کو مجروح کرنا ناممکن تھا، جو ان کے فریق نے ان پر کیا تھا۔ انھوں نے مخدوم عالم کے مقدمہ کی پیروی کا کام اپنے ذمہ لے لیا اور خود اپنے کاغذات کسی دوسرے کے حوالے کر دیے۔ اب صورت یہ ہوئی کہ قاضی غلام امام کے اپنے مقدمہ کی پیروی تو دوسرا شخص کر رہا ہے اور وہ خود اپنے فریق مخالف قاضی مخدوم امام کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور یہ سب مصنوعی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود ہار گئے اور ان کے مخالف قاضی مخدوم عالم جیت گئے۔ (حسب روایت جعفر شاہ پھلواری، مطبوعہ ماہنامہ زندگی، ستمبر 1980)

یہ بہادری اور اعلیٰ ظرفی کی بات ہے کہ آدمی اصول کے آگے جھک جائے، نہ کہ وہ اصول کو خود اپنے آگے جھکائے۔ وہ نقصان اور فائدہ اور عزت اور بے عزتی کے خیالات سے اوپر اٹھ کر اصول کے تقاضوں کو اپنا لے۔ اسی طرح یہ آدمی کی بہادری اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ اگر اس کا مخالف بھی اس کے اوپر اعتماد کر لے تو وہ اس کے اعتماد کو مجروح نہ کرے۔

بلند اخلاقی کی ایک مثال

27 ستمبر 1973ء کی بات ہے۔ پنڈی جوئلرس (چاندنی چوک، دہلی) میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ سردار بشن سنگھ ہیں۔ بی —28 ساؤتھ ایکسٹینشن پارٹ 2، نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ وہ ضلع راولپنڈی کے باشندے تھے۔ تقسیم کے بعد یہاں چلے آئے۔ راولپنڈی سے 30 میل کے فاصلہ پر گوجر خاں ایک قصبہ ہے، وہاں ان کی زمینداری تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اس وقت آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔

انھوں نے اپنے زمانہ کے انگریز افسران کے بہت سے واقعات بتائے۔ ان میں سے ایک واقعہ مسٹر مارسڈن (Marsdon) کا تھا جو اس وقت راولپنڈی میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ 1943 کا واقعہ ہے، مسٹر مارسڈن سردار صاحب کے قصبہ میں آئے۔ ان کو گوجر خان کی تحصیل کا معائنہ کرنا تھا۔ تحصیل جانے سے پہلے سردار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سردار صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ مسٹر مارسڈن نے دعوت قبول نہ کی اور وہ تحصیل چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ مسٹر مارسڈن کی کار سردار صاحب کے مکان کے سامنے رکی۔ وہ باہر نکلے تو سردار صاحب نے کہا: اگر آپ نے میری دعوت قبول کر لی ہوتی تو اتنی دیر میں میں نے کھانا تیار کرا لیا ہوتا اور آپ کھانا کھا کر یہاں سے جاتے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے اب بھی سردار صاحب کی کھانے کی دعوت قبول نہ کی۔ البتہ اپنی لڑکی کو جو اس وقت ساتھ تھی، سردار صاحب کے مکان پر چھوڑ دیا اور کہا کہ یہ کل تک آپ کے یہاں رہے گی۔ آپ جو کچھ کھلانا چاہتے ہیں اس کو کھلائیے۔ سردار صاحب حیرت میں تھے کہ یہ معمہ کیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب خود تو ایک وقت کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں اور لڑکی کو کئی وقت کے لیے چھوڑے جا رہے ہیں۔ ان کو متعجب دیکھ کر مسٹر مارسڈن نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ راولپنڈی میں میرے کچھ عزیز آئے ہوئے ہیں، مجھے وہاں پہنچ کر ان کے ساتھ کھانا کھانا ہے، کیونکہ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ لوگوں پر یہ تاثر ہو کہ ڈپٹی کمشنر صاحب یہاں آئے اور انھوں نے آپ کے مکان پر کھانا نہیں کھایا۔ اس سے آپ کی عزت پر اثر پڑے گا۔ آپ کی عزت کو بچانے کے لیے میں لڑکی کو آپ کے یہاں چھوڑے جا رہا ہوں:

I want to keep your prestige

بڑا آدمی وہ ہے، جو دوسرے کے بارے میں بھی اتنا ہی حساس ہو، جتنا کوئی شخص اپنے بارے میں ہوتا ہے۔ جو دوسرے کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی سمجھے، اور دوسرے کی عزت کو اپنی عزت۔

اعتراف

بھوپال کے قریب ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔ لوگ عام طور پر جاہل اور نماز وغیرہ سے بے تعلق تھے۔ ایک عالم اس گاؤں میں جانے لگے۔ انھوں نے لوگوں کو غیرت دلائی اور ان کو جوڑ کر نماز پر آمادہ کیا اور وہاں جمعہ بھی قائم کیا۔ اب وہاں پنج وقتہ نماز اور جمعہ ہونے لگا۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہ محمد یعقوب مجددی (1203-1339ھ) کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کل تک یہاں ٹھہریں اور کل آپ ہی یہاں جمعہ پڑھائیں۔ حضرت شاہ صاحب کی نظر مسئلہ پر گئی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے چھوٹے گاؤں میں مسئلہ کی رو سے جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ یہ کہہ کر وہ شہر واپس آ گئے، تاکہ یہاں جمعہ کی نماز ادا کر سکیں۔

اس کے بعد مذکورہ عالم کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں نماز کا نظام ٹوٹ گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے گاؤں میں نماز جمعہ کی ادائیگی چھوڑ دی اور کسی بڑے مقام پر بھی جمعہ پڑھنے کے لیے نہیں گئے۔ لوگوں نے شکایت کی کہ آپ نے یہاں جمعہ قائم کر دیا اور حضرت پیر صاحب آئے تھے تو انھوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز ہی نہیں۔ چنانچہ ہم نے جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

مذکورہ عالم یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور فوراً روانہ ہو کر حضرت شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے گاؤں والوں سے یہ کہا ہے کہ یہاں جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے کہا ہاں میں نے کہا ہے۔ اور مسئلہ تو یہی ہے۔ مذکورہ عالم نے کہا کہ حضرت آپ درست فرماتے ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگ نماز چھوڑے ہوئے تھے۔ ان کو کہہ سن کر نماز کی طرف متوجہ کیا ہے۔ شرائط جمعہ کے مسائل اپنی جگہ صحیح ہیں۔ مگر ابھی ان لوگوں میں

اتنی رغبت نہیں کہ وہ جمعہ کی خاطر سفر کر کے باہر جائیں اور مرکزی مقام پر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ ان کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے میں نے وہاں جمعہ کی نماز شروع کرادی تھی تاکہ کسی طرح وہ عادی ہو جائیں۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی نے یہ سنا تو فرمایا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اس کے بعد اگلے جمعہ کو وہ دوبارہ گاؤں میں گئے اور لوگوں سے کہا کہ مذکورہ عالم کا جمعہ قائم کرنا بالکل صحیح تھا۔ "اصل یہ ہے کہ میں نے متن دیکھا تھا، حاشیہ نہیں دیکھا، حاشیہ میں وہ مسئلہ موجود ہے، جو مولوی صاحب نے تم لوگوں کو بتایا۔ اب تم لوگ پہلے کی طرح یہاں نماز جمعہ ادا کرو"۔ اس کے بعد خود وہاں کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ اور پھر شہر واپس آئے۔

ہمت کے ذریعہ

سیف اللہ خاں (پیدائش 1952ء) ایک نوجوان انجینئر ہیں۔ وہ ٹونک (راجستھان) کے ایک شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ ہائر سکنڈری میں انھوں نے سائنس لی تھی، مگر اچھے نمبر نہ لا سکے۔ ہائر سکنڈری کا نتیجہ آیا تو اس نے ان کو صرف یہ خبر دی کہ وہ "علم کے دروازہ" میں داخل ہونے کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔

سیف اللہ خان بازی ہار چکے تھے، مگر وہ ہمت نہیں ہارے تھے۔ ہائر سکنڈری کے امتحان میں ناکامی نے ان کے اندر حوصلہ کا ایک نیا طوفان پیدا کر دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ گھر کے حالات ان کے لیے مزید تعلیمی جدوجہد کے سلسلہ میں حوصلہ افزا ثابت نہ ہوں گے۔ انھوں نے ایک نئے اقدام کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا آبائی وطن ٹونک چھوڑ کر بھوپال چلے گئے، اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئے کہ اب میں ٹونک اسی وقت واپس آؤں گا، جب کہ میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرلوں۔

سیف اللہ خان بھوپال میں اکیلے تھے۔ مگر اکیلے ہو کر انھوں نے اپنے کو زیادہ طاقتور بنالیا تھا۔ اب نہ ان کے شاعر دوست تھے جو اپنی "تازہ غزل" سنا کر ان کا وقت چھیننے کی کوشش کریں۔ نہ گھر کے وہ حالات ان کے سامنے تھے، جو ان کے ذہن کو مسلسل منتشر کرتے رہتے تھے۔ نہ وہ ماحول تھا جو ان کی ناکامی کو یاد دلا کر ان کے حوصلے پست کر دیتا تھا۔ اب وہ تھے اور ان کی جدوجہد تھی۔ انھوں نے ٹیوشن کے ذریعہ اپنی ضروریات کا انتظام کیا اور خاموشی کے ساتھ تعلیمی محنت میں لگ گئے۔ ہر سہارے کا ٹوٹنا ان کے لیے زیادہ بڑا سہارا بن گیا۔ کیوں کہ اس نے ان کی چھپی ہوئی تمام قوتوں کو جگا دیا تھا۔

سیف اللہ خاں نے بھوپال میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے بے پناہ جدوجہد کی۔ پہلے انھوں نے انجینئرنگ کا ڈپلوما لیا۔ اس کے بعد ان کو بھوپال میں ایک ملازمت مل گئی۔ اب وہ ٹیوشن کی دوڑ دھوپ سے آزاد ہو گئے۔ تاہم انھوں نے تعلیم نہیں چھوڑی۔ ملازمت کے دوران ہی انھوں نے بھوپال سے 70 میل دور ودیشہ کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا اور بالآخر وہاں سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر لی۔ تقریباً آٹھ سال تک ان کا معمول یہ تھا کہ صبح 4 بجے اٹھنا، دو گھنٹہ ریل کے سفر کے بعد ودیشہ پہنچنا، وہاں کلاس میں حاضری دے کر واپس آنا اور پھر ملازمت کی ڈیوٹی انجام دینا، اور اس سے فراغت کے بعد کورس کی کتابیں پڑھنا۔ اس دوران ان کے گھر میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ بھوپال کے تقریباً دس سالہ قیام میں ان کو طرح طرح کے خطوط ملتے رہے۔ مگر وہ ہر خط کو پڑھ کر نہایت خاموشی سے رکھ دیتے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ 10 سال تک اپنے عہد پر قائم رہے۔ انھوں نے کسی بات کا اثر لیے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اپنے لیے کامیاب زندگی حاصل کرنے کی تڑپ نے ان کے اندرونی احساس کو اتنا طاقتور کر دیا کہ تمام ناموافق حالات کے باوجود انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

کام پر انعام

روس کے سابق وزیر اعظم مسٹر خروشچیف (Nikita Khrushchev, 1894-1971) اور مسٹر بلگانن (Nikolai Bulganin, 1895-1975) 1956ء میں ہندستان آئے تھے۔ مسٹر خروشچیف کو بتایا گیا کہ دہلی یونیورسٹی نے طے کیا ہے کہ آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا:

In Russia, we have to work for it.

روس میں اس کے لیے ہمیں کام پیش کرنا پڑتا ہے (ٹائمس آف انڈیا، 12 جون 1980)۔ کسی قوم کی زندگی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس میں خطابات اور مناصب اور اعزازات حقیقی کام کی بنیاد پر دیے جاتے ہوں، نہ کہ سیاست اور خوشامد کی بنیاد پر۔ اہلیت کی بنیاد پر جب کسی کو کوئی اعزاز ملتا ہے تو لوگ اس کو ایک ہونے والے واقعہ کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح محنت کریں تا کہ ہم کو بھی یہ مقام ملے۔ اس کے برعکس، جب اہلیت کے بغیر کسی کو کوئی اعزاز دیا جائے تو لوگوں کے اندر اس کا سخت ردعمل ہوتا ہے۔ اب ایک دوسرے کے بارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ محنت کر کے پانے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے بجائے اِدھر اُدھر کی تدبیروں سے حاصل کرنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے اور بالآخر پورے سماج کی فضا خراب ہو جاتی ہے۔

اہلیت کے بجائے دوسری بنیادوں پر انعام دینے کا رواج خود ہمارے مذہبی اداروں میں بھی چل پڑا ہے۔ آج ایک مذہبی ادارہ میں سب سے بڑی لیاقت نیاز مندی ہے، اور سب سے بڑی نااہلی یہ ہے کہ آدمی نیاز مند بن کر نہ رہتا ہو۔ ایک آدمی اگر اپنے گروپ کا ہے تو اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کیا جائے گا اور اگر وہ اپنے گروپ کا نہیں ہے تو اس کے

ساتھ تنگ ظرفی کا معاملہ ہوگا۔ کوئی شخص تنقیدی مزاج رکھتا ہو تو ان اداروں میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی، اور جو آدمی ہاں میں ہاں ملاتا ہو وہ ہر قسم کے اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا، خواہ وہ کتنا ہی نا اہل کیوں نہ ہو۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں میں علم اور محنت کی فضا ختم ہوگئی ہے۔ جہاں مقام حاصل کرنے کے لیے محنت اور قابلیت غیر اہم چیزیں بن جائیں، وہاں کسی کے اندر محنت اور قابلیت کا شوق کیوں پیدا ہوگا۔ آدمی اسی چیز پر اپنی توجہ لگاتا ہے، جس کو وہ اپنے لیے عزت اور ترقی کا زینہ سمجھتا ہو۔ جب عزت اور ترقی، محنت اور قابلیت کے بغیر سستی چیزوں کے ذریعہ مل رہی ہو تو کون احمق ہوگا، جو سستی چیز کو چھوڑ کر مہنگی چیز کا خریدار بنے۔

فرشتہ کا ٹیلیفون

وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ زندگی بہت مصروف تھی۔ دولت کی بارش اور پیشہ کی سرگرمیوں میں دین کا کوئی خانہ نہ تھا۔ اس کو یہ موقع ہی نہ تھا کہ وہ دینی کتابیں پڑھے یا دینی موضوعات پر کچھ سوچ سکے۔ اس کے پاس آنے والے سب وہی ہوتے تھے، جو اس کے پیشہ کے تقاضوں کے اعتبار سے اس سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ البتہ ایک شخص کبھی کبھی اس کے یہاں آتا تھا، اور دین کے بارے میں اس سے بات کرتا تھا۔ مگر یہ گفتگو ہمیشہ ناتمام ختم ہو جاتی تھی۔ آنے والے آدمی کو تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوتا کہ ڈاکٹر اس قسم کی گفتگو کو غیر اہم سمجھ کر اس سے بے توجہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ آدمی خود ہی اپنی گفتگو کو ختم کر کے تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا اور اس کے بعد چلا جاتا۔

ایک روز ڈاکٹر اپنے گھر کے کمرہ میں اکیلا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ "ہلو" کے تبادلہ کے بعد دوسری طرف سے آواز سنائی دی "میں جبریل بول رہا ہوں۔ خدا تم کو بلانا چاہتا ہے"۔ آواز عجیب بھیانک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غیر انسانی مخلوق انسانی زبان میں بول رہی ہے۔ ڈاکٹر پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ اور رسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے ہوش وحواس درست ہوئے تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسی آواز تھی جو ٹیلیفون پر سنائی دی کہ "میں جبریل بول رہا ہوں۔ خدا تم کو بلانا چاہتا ہے"۔ سنی ہوئی آواز اس کو لفظ بہ لفظ یاد تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے، اور اس کے جواب میں اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے تمام دوستوں کو ٹیلیفون کر ڈالا اور ہر ایک سے پوچھتا رہا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے ڈاکٹر کو اس قسم کا ٹیلیفون کیا ہے۔

ڈاکٹر کئی روز تک اسی سوچ میں پڑا رہا۔ ٹیلیفون پر سنی ہوئی بھیانک آواز کسی طرح اس کی یاد سے نہیں نکلتی تھی۔ آخر ایک روز مذکورہ آدمی آیا۔ ڈاکٹر نے اس سے اپنے واقعہ کا ذکر کیا۔ آدمی ایک منٹ خاموش رہا اور اس کے بعد بولا: یہ تمھارے نام فرشتہ کا پیغام تھا۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو حج پر جانا چاہیے۔ ڈاکٹر کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے فوراً تیاری شروع کر دی۔ اور پہلا موقع آتے ہی حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کا حج اس کی زندگی کا بڑا تاریخی واقعہ تھا۔ حج کے دوران اس پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ رب کعبہ کے مخصوص بلاوے پر دیار حرم میں حاضر ہوا ہے۔ واپس آنے کے بعد چہرہ پر داڑھی اور پنج وقتہ نمازوں کے اہتمام نے بتایا کہ ڈاکٹر اب نیا انسان بن چکا ہے۔

ڈاکٹر کی زندگی میں یہ انقلاب اس لیے آیا کہ "جبریل" کی آواز سن کر اس نے سمجھا کہ براہ راست آسمان سے اس کو پکارا جا رہا ہے۔ جب کہ مذکورہ شخص کی تبلیغ اس کو محض ایک انسان کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ تاہم اگر آدمی کی فطرت بیدار ہو جائے تو اس کو "ٹیلیفون"

پر جبریل کی آواز سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کو نظر آئے گا کہ ستاروں سے لے کر درختوں تک ہر چیز خاموش زبان میں وہی پیغام دے رہی ہے جس کو ڈاکٹر نے "جبریل" کی طرف سے ٹیلیفون کی زبان میں سنا۔

آپ بیتی

یہ 31 جنوری 1976ء کا واقعہ ہے، جب کہ راقم الحروف لیبیا جاتے ہوئے 36 گھنٹہ کے لیے روم (اٹلی) میں ٹھہرا تھا۔ روم کی یادوں میں سے ایک یاد وہ جرمن پادری ہے جس سے وہاں میری ملاقات ہوئی:

Dr. Hans Georg Asmussen Propst,
Beselerstrabe 28-2240 Heide,
Telefon (0481) 3220, W. Germany

ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ موصوف عربی انجیل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے میں نے سمجھا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مجھے بائبل اور اس سے متعلقہ لٹریچر کے مطالعہ کا شوق ہے۔ میرے پاس انگریزی میں چھپی ہوئی چیزیں موجود ہیں۔ مگر میں بائبل کا مکمل عربی ترجمہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مقصد صرف ناشر کا پتہ پوچھنا تھا، تا کہ وہاں سے عربی بائبل منگائی جا سکے۔ مگر پادری موصوف نے ناشر کا پتہ بتانے کے بجائے خود میرا پتہ دریافت کیا اور اپنی ڈائری میں میرا پتہ نوٹ کرتے ہوئے کہا: میں آپ کو عربی بائبل بھجواؤں گا۔

اس واقعہ کو تقریباً ایک برس گزر چکا تھا اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ پادری صاحب یا تو اپنا وعدہ بھول گئے یا انھوں نے کتاب روانہ کی اور وہ کسی وجہ سے مجھ تک نہیں پہنچی۔ مگر

فروری 1977 کی ایک تاریخ کو ڈاک سے ایک پیکٹ ملا۔ کھولا تو اس کے اندر پرانے اور نئے عہد نامہ پر مشتمل "الکتاب المقدس" کا ایک نیا نسخہ موجود تھا۔ فولڈنگ جلد کے ساتھ بائبل پیپر پر چھپا ہوا یہ خوبصورت نسخہ 1684 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ روانگی میں تاخیر کا امکانی سبب کیا تھا۔ پرنٹ لائن کے مطابق بائبل کا یہ عربی نسخہ کوریا میں ابھی 1976 میں چھپا ہے۔ غالباً پادری موصوف کے پاس یا ان کے ادارہ میں عربی نسخے ختم ہو گئے تھے اور جب کوریا سے چھپ کر وہ انھیں پہنچے ہیں تو حسب وعدہ انھوں نے فوراً اس کی روانگی کا انتظام کیا۔

پادری موصوف کے نام جب میں نے شکریہ کا خط روانہ کیا تو خیال آیا کہ کاش ہم بھی اسی طرح "شکریہ کے خطوط" وصول کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو قرآن کو اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم ان کو قرآن کے ترجمے ان کی زبان میں اس طرح فراہم نہیں کر سکے جس طرح مسیحی حضرات دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی مقدس کتاب کو دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بنی آدم کی طرف خدا کے آخری منذر (آگاہ کرنے والے) تھے۔ آپ نے قرآن کے ذریعے انذار کی یہ ذمہ داری ادا فرمائی اور اپنے بعد کتاب اللہ کو محفوظ حالت میں چھوڑ گئے کہ وہ قیامت تک لوگوں کے لیے آگاہی کا ذریعہ بنتی رہے۔

آپ کے بعد یہ قرآن کس طرح لوگوں تک پہنچے گا۔ اس کا ذریعہ امت محمدی ہے۔ امت محمدی کی پہلی اور لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو تمام اقوام عالم تک پہنچائے۔ مگر افسوس کہ آج ساری دنیا میں کوئی بھی ادارہ خاص اس مقصد کے لیے قائم نہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان اپنی اس ذمہ داری کے شعور تک سے غافل ہو چکے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ میں "بنی اسرائیل کی کھوئی بھیڑوں" کے پاس بھیجا گیا ہوں، مگر آپ کے پیروؤں کے جوشِ تبلیغ نے مسیحیت کو ساری دنیا کے لیے قابل مطالعہ بنا دیا۔ اس کے برعکس، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح لفظوں میں اعلان فرمایا کہ میری بعثت سارے عالم کے لیے ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 335)۔ مگر آپ کے پیروؤں کے اندر یہ آگ نہیں بھڑکتی کہ آپ کے پیغام کو سارے عالم تک پہنچائیں — جرمن پادری کی طرف سے میں نے عربی بائبل کا نسخہ وصول کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "دیکھو تم اسلام کا پیغام پھیلانے میں ناکام رہ گئے اور ہم ساری دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں"۔

(وحیدالدین خاں، پیدائش 1925، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی)

خارجی ختم ہو گئے
خارجیت زندہ ہے

ایک بار خارجی فرقہ کے چالیس آدمیوں نے ابن زیاد کے دو ہزار سپاہیوں کو مار بھگایا تھا۔ اس پر ایک خارجی شاعر نے فاتحانہ نظم لکھی۔ چند اشعار یہ ہیں:

أَأَلْفَا مُؤْمِن فِيمَا زَعَمْتُمْ ... وَيَقْتُلَكُمْ بِآسِكَ أَرْبَعُونَا

كَذَبْتُمْ لَيْسَ ذَاكَ كَمَا زَعَمْتُمْ ... وَلَكِنَّ الْخَوَارِجَ مُؤْمِنُونَا

هِيَ الْفِئَةُ الْقَلِيلَةُ قَدْ عَلِمْتُمْ ... عَلَى الْفِئَةِ الْكَثِيرَةِ يُنْصَرُونَا

کیا تم اپنے گمان کے مطابق دو ہزار مومن تھے اور تم کو مقام آسک پر صرف چالیس نے مار بھگایا، تم جھوٹے ہو اور تمھارا خیال غلط ہے، درحقیقت خوارج مومن ہیں، تم نے جان لیا کہ یہی وہ تھوڑی جماعت ہے جو بڑی جماعت پر غالب آتی ہے۔ (معجم البلدان، یاقوت الحموی، جلد 1، صفحہ 54)

خارجی شاعر کی اس دلیل کو آج کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی ہمارے درمیان بے شمار لوگ ہیں جو اس قسم کی وقتی اور ظاہری کامیابیوں کو اپنی صداقت کا لازمی ثبوت سمجھتے ہیں — خارجی فرقہ دنیا سے ختم ہو گیا، مگر خارجیت آج بھی دنیا میں زندہ ہے۔

غلطی میری ہے

1954ء میں جب کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا، ایک واقعہ پیش آیا جو کہ اب تک مجھے یاد ہے۔ میرے استاد ڈاکٹر پران ناتھ نے لاپلاس ٹرانسفارم کو پڑھانا شروع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی ہے، جو ہمارے موجودہ پرنسپل سے متعلق ہے۔ یہ پروفیسر ایم۔ سین۔ گپتا تھے جو اس وقت ہندو یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر گپتا مزید تعلیم کے لیے گلاسکو یونیورسٹی گئے تھے اور وہاں سے انھوں نے ٹاپ کیا تھا۔ گلاسکو کا پروفیسر ایک روز بلیک بورڈ پر ایک الیکٹریکل پرابلم کو حل کر رہا تھا۔ اس درمیان میں Differential Equation کا ایک سوال آ گیا۔ گلاسکو پروفیسر نے اس کو عام طریقے سے حل کیا، جس میں کافی وقت لگا اور سارا بلیک بورڈ بھر گیا۔

پروفیسر گپتا نے اس موقع پر اپنے پروفیسر سے کہا: میرا خیال ہے کہ یہاں لاپلاس ٹرانسفارم کو اپلائی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ سوال بہت مختصر طریقہ سے حل ہو جائے گا۔ پروفیسر نے اس تجویز پر عمل کیا تو صرف دو لائنوں میں سوال حل ہو گیا۔ اگر چہ دونوں طریقوں کا آخری جواب ایک ہی تھا۔ مگر پروفیسر نے کہا: جب مختصر طریقہ ہمارے پاس موجود ہے تو

لمبے طریقے کو اختیار کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نے بلیک بورڈ پر اپنے حل کو مٹا دیا اور پروفیسر گپتا کے طریقہ کو لکھتے ہوئے کہا — یہی واحد طریقہ ہے:

This is the only method

اس قسم کا ایک اور واقعہ 1964ء کا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے امریکی حکومت کے ایجوکیشن ڈویژن کے تعاون سے "سمر اسکول فار ٹیچرس" کا ایک پروگرام شروع کیا۔ ہندستانی شخصیتوں کے علاوہ تین امریکی پروفیسر آئے تھے، اس وقت میں چندولی پالی ٹیکنیک میں سینئر لکچرر تھا اور اسی حیثیت سے چنڈی گڑھ کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا کورس تھا جو 15 جون سے 24 جولائی 1964ء تک ہوا۔

امریکی پروفیسر میچل نے ایک روز کلاس میں سوال کیا— تخلیقی لوگ کون ہوتے ہیں:

Who are Creatives

مختلف لوگوں نے مختلف نام لیے۔ ایک شخص نے کہا پوئیٹ (شاعر) پروفیسر نے کہا، کیا (What)۔ پروفیسر میچل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بار بار واٹ کہتے رہے اور ہمارے ساتھی بار بار "پوئیٹ" دہراتے رہے۔ بالآخر انھوں نے اس کی اسپلنگ بتائی: پی او ای ٹی۔ اب پروفیسر میچل سمجھ گئے کہ ہمارے ساتھی کی مراد شاعر سے ہے۔ مگر ہندستانی اور امریکی تلفظ کے فرق کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ ہندستانی تلفظ اس لفظ کا پوئیٹ ہے۔ جبکہ امریکی تلفظ میں اس کو پائیٹ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

You are right, I am wrong because I am in your country.

آپ صحیح ہیں۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت آپ کے ملک میں ہوں۔

عبدالمحیط خاں (پیدائش 1932ء) پرنسپل گورنمنٹ پالی ٹکنک، فیض آباد

تاریخ ساز بنئے

ایک بزرگ نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ شروع شروع میں اس تعلیم گاہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اساتذہ کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتیں۔ طلبا کے لیے بعض اوقات کھانے کا انتظام ناممکن ہو جاتا۔ چھپر کے سایہ کے نیچے تعلیم دی جاتی۔ اس طرح کی بے شمار دشواریوں کے درمیان اس درس گاہ کو سفر کرنا پڑا۔

مگر دشواریاں جس طرح آدمی سے کچھ چیزیں چھینتی ہیں، اسی طرح وہ اسے کچھ چیزیں دیتی بھی ہیں۔ ظاہری اسباب کی کمی عزم وہمت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ایسے جذبات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو فراوانی کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

اس تعلیمی ادارے کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک روز سارے ادارے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات بے حد نامساعد نظر آرہے تھے۔ درس گاہ کے ناظم نے طلبا و اساتذہ کا ایک اجتماع کیا۔ جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

> ”موجودہ حالات میں ممکن ہے آپ کا جی ملامت کرتا ہو کہ آپ کہاں آ کر پھنس گئے۔ کسی بنی بنائی درس گاہ میں گئے ہوتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ مگر یہ گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ دوسرے اگر حال کے وارث ہیں تو یہاں آپ ایک نئے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔ لوگ تاریخ خواں ہوتے ہیں، مگر آپ کو قدرت نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ تاریخ ساز بن سکتے ہیں“۔

یہ الفاظ جن حالات میں کہے گئے تھے، اس کے اعتبار سے وہاں اس نے بجلی کا کام کیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر سے آشنا ہوئے۔ یہ کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے حال میں جدوجہد کی جائے۔ یہ قدر، نفسیاتی طور پر، اس وقت ان کے لیے لامعلوم رہتی۔ جب کہ وہ ایسے حالات میں نہ ہوتے۔ اسی طرح

ناظم درس گاہ کی زبان سے بھی ہرگز یہ الفاظ نہ نکلتے اگر وہ آسودگی اور فارغ البالی میں ہوتے۔ ناظم اسی لیے یہ الفاظ بول سکے اور سننے والے اسی لیے ان کو سمجھ سکے کہ وہ دشوار حالات میں تھے۔ آسانیوں کی فضا میں انھیں یہ سبق نہیں مل سکتا تھا۔

جو لوگ اپنے آپ کو مشکل حالات میں پائیں وہ اسے اپنی بدقسمتی تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف سمجھنے کی غلطی ہے۔ اگر صحیح ذہن ہو اور عزم بیدار ہو تو مشکل حالات اس سے زیادہ بڑی چیزیں دیتے ہیں، جو آسانیوں اور راحتوں میں کسی کو ملتی ہیں۔ دشواریاں آپ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ آپ کے اندر سوز و درد پیدا کر کے آپ کے کلام کو بے پناہ بنا دیتی ہیں۔ مشکلات کو عبور کرنے کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہیں اور بالآخر آپ کو ان بلند ترین انسانوں میں شامل کرتی ہیں، جن کو تاریخ خواں کے مقابلے میں تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔

اب خدا کے فضل سے یہ ادارہ ''چھپر'' کے دور سے نکل کر ''بلڈنگ'' کے دور میں داخل ہو چکا ہے، اور تعلیم کے میدان میں ملت کو ایک نئی راہ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہر بار جب کوئی شخص نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں تذبذب کا مرحلہ لازماً آتا ہے، لیکن اگر وہ جما رہے تو استحکام کے مرحلہ پر پہنچنے سے بھی کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

حوصلہ کا نام طاقت

نومبر کا مہینہ تھا اور رات کے تقریباً 12 بجے کا وقت۔ طالب علم اپنے کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس کی چارپائی کے پاس شلف میں مجلد کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ طالب علم نے نیند کی حالت میں کروٹ لی اور اس کا ہاتھ شلف پر چلا گیا۔ اچانک وہ ایک چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو ہاتھ کی انگلی میں دانت دھنسنے کا نشان تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ ''مجھے سانپ

نے کاٹ لیا"۔ وہ چلّایا اور کمرہ کے باہر نکل آیا۔ اُس کی آواز سن کر قریب کے کمروں کے لڑکے بھی جمع ہو گئے۔ اس وقت طالب علم کا جسم پسینہ سے تر تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص نے علاج کی غرض سے نیم کی پتیاں لا کر دیں تو وہ بے تکلف ان پتیوں کو کھا گیا اور اسے کڑوے پن کا احساس تک نہیں ہوا۔

وہاں ایک اور طالب علم تھا جس کا پورا خاندان طبیبوں کا تھا۔ اس نے آ کر (مار گزیدہ) طالب علم کا ہاتھ دیکھا۔ اس کے زخم پر نظر ڈالی "دانت تو ضرور دھنسے ہیں۔ مگر یہ دانت۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈنڈا لیا اور کمرے میں روشنی کر کے اس کو اندر سے بند کر لیا۔ جو لوگ کمرہ کے باہر کھڑے تھے، انھوں نے اندر سے ڈنڈا پیٹنے کی آواز سنی تو انھوں نے سمجھا کہ وہ سانپ کو مار رہا ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ طالب علم کمرہ سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سانپ کے بجائے ایک مرا ہوا چوہا تھا جس کو وہ دُم سے پکڑ کر لٹکائے ہوئے تھا۔ "دیکھو یہ تھی وہ چیز جس نے تمھیں کاٹا ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمھاری انگلی کا زخم دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سانپ کا کاٹا نہیں ہو سکتا۔ چوہے کے دانت اور سانپ کے دانت میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن اگر میں یوں ہی کہتا تو تمھیں یقین نہ آتا۔ اس لیے میں نے چاہا کہ پہلے چوہے کو پکڑ کر ماروں اور اس کے بعد تمھیں بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے"۔

یہ باتیں سن کر اور مرا ہوا چوہا دیکھ کر یکا یک طالب علم اٹھ بیٹھا۔ اب وہ بالکل اچھا تھا۔ "مجھے یاد آیا" اس نے کہا "کل ہی میرے یہاں نئی نئی کتابیں جلد بن کر آئی ہیں۔ نئی جلدوں میں لئی کی بو پا کر اکثر چوہے آجاتے ہیں اور وہی قصہ یہاں بھی پیش آیا"۔

وہی طالب علم جس پر چند منٹ پہلے موت کی بدحواسی طاری تھی، اب بالکل ہشاش بشاش اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی علاج نہیں کیا گیا تھا۔

اسس کو صرف یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اسس کو جسس چیز نے ڈسا ہے، وہ سانپ نہیں بلکہ چوہا ہے۔

یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ ہماری قوم اس وقت اپنے مسائل سے اس قدر پریشان ہے کہ زندگی کا حوصلہ تک اس سے رخصت ہورہا ہے، مگر یہ پریشانی حقیقی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ اگر قوم کے دل میں یہ بات اتاری جاسکے کہ تمہارا مسئلہ چوہے کا مسئلہ ہے، نہ کہ سانپ کا مسئلہ تو قوم کی حالت بالکل بدل جائے گی اور وہ حوصلہ اور اعتماد کی ان تمام نعمتوں کو دوبارہ پالے گی جن کو وہ موجودہ حالت میں کھو چکی ہے۔

(محمد خالد اعظمی، پیدائش 1928، اردو لیتھو پریس، اسٹریٹ نمبر 4، شاہدرہ، دہلی)

اسلامی تاریخ پر مطالعہ

ڈاکٹر تاراچند جنھوں نے اسلامی تاریخ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر تاراچند (1973-1888) فارسی زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ اسی لیے پنڈت نہرو نے 1952ء میں ان کو ایران کا سفیر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے سرّ اکبر (اپنشد کا فارسی ترجمہ از داراشکوہ) کو ایڈٹ کیا تھا جس کو حکومت ایران نے خصوصی اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔

1913ء میں انھوں نے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ کائستھ پاٹھ شالہ (ڈگری کالج) میں استاد ہوگئے۔ کائستھ پاٹھ شالہ ٹرسٹ کے صدر کرنل رنجیت سنگھ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ٹرسٹ کے اگزیکٹیو کے سامنے تجویز پیش کی کہ نوجوان استاد کو ریسرچ کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ بیشتر ممبروں نے شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ مگر کرنل رنجیت سنگھ نے بزور اس تجویز کو منظور کرایا اور ان کے سفر کے تمام انتظامات کیے۔

اس کے بعد ڈاکٹر تارا چند آکسفورڈ گئے۔ وہاں وہ کوئنس کالج میں تین سال (1919-1922) رہے، اور ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا— ہندستانی کلچر پر اسلام کا اثر:

The influence of Islam on Indian culture

حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے تحت انھوں نے ہندستان کی آزادی کی تاریخ پر چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کی کتاب کی تیاری میں اپنی آخری زندگی کے 14 سال صرف کیے۔ اس کتاب کی پہلی جلد 1961 میں اور چوتھی جلد 1973 میں شائع ہوئی۔

مسٹر سریش رام نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر تارا چند کے غیر جانب دارانہ رائے قائم کرنے (dispassionate judgment) کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ 1937 میں یوپی میں کانگریس کا مسلم لیگ کو وزارت میں شریک نہ کرنا ایک انتہائی نزاعی مسئلہ ہے۔ مگر اس کے بارے میں ڈاکٹر تارا چند نے لکھا:

> Admitting that there could be two opinions concerning the constitutional propriety of the decision to refuse the appointment of the Muslim leaguers to the Congress cabinet, it is diffcult to justify its wisdom. (Vol. 4 , P.238)

یہ مانتے ہوئے کہ کانگریس کابینہ میں مسلم لیگی نمائندوں کو شریک کرنے کی قانونی اہمیت پر دورائیں ہوسکتی ہیں، اس کی معقولیت کو ثابت کرنا سخت مشکل ہے۔ (نیشنل ہیرلڈ، لکھنو، 7 نومبر 1976ء)

ڈاکٹر تارا چند کا خاتمہ بظاہر اس بات کی علامت تھا کہ غیر مسلموں میں وہ نسل اب ختم ہو گئی جو اردو، عربی، فارسی زبانیں جانتی ہو اور اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب کے پس منظر میں سوچنے کی علمی صلاحیت رکھتی ہو۔ مگر حالیہ برسوں میں پٹرول کی کرامت نے از سر نو عربی اور

فارسی کو زندہ کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم ان موضوعات میں داخلے لے رہے ہیں۔ یہ بھی شاید بالواسطہ طور پر اس حدیث نبوی کی تصدیق ہے کہ یہ دین ہمیشہ زندہ رہے گا، سیاسی اور زمانی انقلابات کبھی اس میں کامیاب نہ ہوں گے کہ خدا کے دین کو ماضی کی چیز بنا کر تاریخ کی الماری میں بند کر دیں۔

حادثات ہیرو بنا دیتے ہیں

31 اگست 1976ء کا واقعہ ہے۔ دہلی کے روزری اسکول (نزدیک ریڈیو کالونی) کے میدان میں لڑکے جمع تھے۔ اتنے میں ایک کالا سانپ نکلا اور ایک چھ سالہ بچے کو لپیٹ لیا۔ بچہ چیخنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی چیختے ہوئے بھاگے۔ چیخ پکار کی آواز اسٹاف روم تک پہنچی اور اسکول کی استانیاں بچہ کی طرف دوڑیں۔

مگر اس کا خوفناک حال دیکھ کر سب سہم گئیں۔ اتنے میں ایک استانی خاموشی کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک اخبار تھا۔ اس نے اخبار کو سانپ کے منھ پر رکھا اور پوری طاقت سے اس کو پکڑ کر بچے کے پاؤں سے الگ کر دیا۔ لڑکا فوراً قریب کے ہندو راؤ اسپتال میں لے جایا گیا، جہاں وہ چند دن کے علاج سے اچھا ہو گیا۔ سانپ کو اسپتال کی لیبورٹری میں پہنچا دیا گیا، جہاں وہ زندہ حالت میں موجود ہے۔

استانی کا نام مسز جان ہے۔ اور بچہ کا نام راجن کپور۔

مسز جان نے اس سے پہلے کبھی سانپ نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے اس موذی سانپ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ اب تو مجھے اس کو سوچ کر بھی ڈر لگتا ہے"۔

یہ دراصل "حادثہ" تھا جس نے مسز جان کو اس حیرت ناک بہادری کے لیے آمادہ کیا۔ حادثات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔

مولانا محمد علی (1878-1931) جب بیتول جیل میں نظر بند تھے، ان کی اہلیہ جیل خانہ میں ان سے ملاقات کے لیے گئیں۔ انھوں نے اپنے شوہر مولانا محمد علی سے کہا:

"تم ہماری فکر نہ کرنا۔ خدا ہی پہلے بھی رازق تھا اور اب بھی وہی رازق ہے۔ تم صرف ایک واسطہ تھے۔ اور خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "رہا تمھارا کام، سو اگر اجازت ہو تو میں اسے کرتی ہوں"۔ (مضامین محمد علی، جلد اول، صفحہ 84-83)

چنانچہ انھوں نے کام شروع کیا اور دو سال کے عرصے میں 45 لاکھ روپے کا چندہ خلافت تحریک کے لیے جمع کر لیا۔

یہ زیر نظر تحریر لکھے جانے سے 45 سال پہلے کا واقعہ ہے، جب کہ "لاکھ" کا مطلب اس سے بہت زیادہ تھا، جو آج سمجھا جاتا ہے۔

پہلے کچھ سہنا پڑتا ہے

بعض قوموں میں گودنا گدوانے کا رواج ہے۔ پہچان کے لیے یا تبرک کے لیے جسم کے کسی حصہ پر خاص شکلیں یا نام بنوا لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مطلوبہ شکل کے مطابق پہلے سوئی سے چھید کیا جاتا ہے اور پھر ان چھیدوں میں مسالہ بھر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کالے رنگ کا نقشہ بن جاتا ہے جو عمر بھر رہتا ہے۔

قصہ ہے کہ ایک آدمی گودنا گودنے والے کے پاس گیا اور کہا کہ میرے ہاتھ پر شیر کی شکل بنا دو۔ گودنے والے نے اپنی سوئی اٹھائی اور نشان لگانا شروع کیا۔ سوئی کی چبھن آدمی کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اس نے کہا "کیا بنا رہے ہو"۔ گودنے والے نے کہا "دم"۔ آدمی نے کہا "کیا دم کے بغیر شیر نہیں ہوتا"۔ گودنے والے نے کہا اچھا۔ اور دوسری چیز بنانے لگا۔ اب پھر سوئی کی نوک چبھنے لگی۔ آدمی نے کہا اب کیا بنا رہے ہو۔ اس

نے کہا ”پاؤں“۔ آدمی نے کہا” کیا پاؤں ضروری ہے“۔ گودنے والے نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اب وہ دوسری چیز گودنے لگا۔ آدمی کے اندر پھر بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا ”اب کیا بنا رہے ہو“ اس نے کہا ”جبڑا“۔ آدمی نے کہا کیا جبڑا ضروری ہے۔ تم بغیر جبڑے ہی کے شیر بنادو“۔ غرض اس طرح وہ ایک ایک چیز کو منع کرتا گیا اور بالآخر یہ ہوا کہ شیر کی تصویر نہ بن سکی، صرف چند متفرق نشانات اس کے ہاتھ پر بن کر رہ گئے—— ہر مقصد کے لیے ابتداءً کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اگر آدمی سہنے کے لیے تیار نہ ہوتو وہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

عبدالحمید چھوٹانی (پیدائش 1923ء) پاکستان کے ایک ممتاز سائنس داں ہیں۔ وہ بمبئ آئے۔ اس موقع پر ایک اخباری رپورٹر نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا: ”انجینئرنگ کے میدان میں پاکستان اتنا پیچھے کیوں ہے“۔ مسٹر چھوٹانی نے جواب دیا:” یہ صحیح ہے کہ ہم انجینئرنگ میں ابھی تک قابل قدر ترقی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی خاص وجہ ہے ہمارے یہاں بنیاد (base) کی کمزوری۔ اکادکا انڈسٹری سے آخر کتنی ترقی کی امید کی جاسکتی ہے۔ (اخبار عالم، 14 اپریل 1979) یعنی تعلیم گاہیں اسی وقت انجینئر زیادہ پیدا کریں گی، جب کہ ان کی کھپت کے لیے ملک میں زیادہ صنعتیں بھی موجود ہوں۔ صنعتوں کی کمی ہوتو کوئی ملک زیادہ انجینئر پیدا نہیں کرسکتا۔

اسی طرح ہر کام کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ بنیاد کے بغیر کوئی اقدام کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ مثلاً جمہوری دور میں سیاست کی بنیاد عوامی رائے ہے۔ اگر آپ کو عوامی ووٹروں کی اکثریت حاصل نہ ہوتو گویا آپ کے پاس وہ بنیاد ہی نہیں ہے، جس پر الیکشن لڑے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ الیکشن میں کودیں تو لازماً آپ ہاریں گے، اور اگر آپ کے اندر اعتراف کا مادہ نہیں ہے تو مزید یہ حماقت کریں گے کہ اپنی ہار کو چھپانے کے لیے یہ شور کریں گے کہ الیکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر موقع ملے گا تو فوج سے

سازباز کر کے مقبول عوام لیڈروں کو قتل کرائیں گے تاکہ آپ عوامی بنیاد نہ ہونے کے باوجود حکومت کی گدی پر پہنچ سکیں۔ اگرچہ اس قسم کی کوشش کبھی کسی کے لیے نتیجہ خیز نہیں ہوئی ہے۔ مستقبل کے اعتبار سے، یہ ملک کی بربادی ہے اور بالآخر خود اپنے آپ کی بھی۔

خودنمائی کے شوق میں

ایک صابن ہے۔ اس کا اشتہار اخبارات میں ایک خاص منظر کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس منظر میں ایک لڑکی آبشار کے نیچے نہاتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ یہ منظر کسی آرٹسٹ کے برش نے نہیں بنایا ہے۔ وہ ایک حقیقی منظر ہے۔ یہ مہم 1969 میں شروع کی گئی اور برسوں کے بعد تکمیل کو پہنچی۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔ جنگل، سمندر اور دوسرے مقامات کا تجربہ کرنے کے بعد بالآخر آبشار کے غسل کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ کیوں کہ آبشار کے گرتے ہوئے پانی میں نہانے کا منظر سب سے زیادہ عوامی کشش رکھتا تھا۔ مختلف آبشاروں کا جائزہ لینے کے بعد کوڈائی کنال کو مقامِ غسل کے لیے چنا گیا۔

سب سے مشکل یہ تھا کہ یہ کام صرف جاڑوں میں ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ اسی موسم میں پہاڑی آبشاروں میں تیز دھارا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس مقصد کے لیے ایک نازک لڑکی کا انتخاب ضروری تھا، جو نہاتے وقت "پانی کی پری" معلوم ہو۔ یہ ایک جان جوکھم منصوبہ تھا۔ مگر ماڈلنگ کے پیشہ نے اس کو آسان بنا دیا۔ ایڈورٹائزنگ کمپنی کا عملہ جس کو انتظام کرنا اور فوٹو لینا تھا، مکمل طور پر گرم کپڑوں سے لدا ہوا تھا۔ دوسری طرف ان کی پارٹی کی سب سے زیادہ نازک اور کمزور ممبر صبح 7 بجے ٹھٹھرتے ہوئے پانی کے ریلے میں چھلانگ لگاتی تھی۔ پھسلتی ہوئی چٹانوں پر پانی کے مسلسل گرتے ہوئے دریا کے نیچے اس کو اس

طرح نہانا پڑتا تھا کہ اس کے چہرے پر صرف فرحت اور خوش گواری کی ہنسی ہو۔ خوف اور گھبراہٹ کی کوئی علامت اس پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ کیڑے مکوڑے اور پانی کے سانپ ان سب کے علاوہ تھے۔ کمپنی کے لوگوں کو کبھی لڑکی کو جگانا نہیں پڑا۔ وہ ہر روز صبح کو 5 بجے اپنے گھر پر تیار ملتی تھی۔

یہ واقعہ درجن سے زیادہ بار دہرایا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں فوٹو لیے گئے۔ پھر اس ایک فوٹو کا انتخاب ہوا جو آج لوگوں کو اخبار کے اشتہارات میں نظر آتا ہے۔ لڑکی کے لیے اس ایک فوٹو کی قیمت تھی پندرہ ہزار روپیہ — ماڈلنگ کا یہ پیشہ آج ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر رائج ہے۔

" کیا چیز ہے جو لڑکوں اور لڑکیوں کو ماڈلنگ کے اس سخت کام کی طرف راغب کرتی ہے"۔ ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ایک افسر نے اس سوال کے جواب میں کہا:

It is, primarily, a case of vanity (Famina, 22 july 1978)

بنیادی طور پر اس کی وجہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہر طرف اس کو اخبارات و رسائل میں اپنا چہرہ چھپا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے — خودنمائی کا یہ جذبہ جو ایک "پروفیشنل ماڈل" کو جان جوکھم کام کی طرف لے جاتا ہے، وہی ایک "لیڈر" کے کام کا محرک بھی ہے۔ اگر چہ اول الذکر کے مظاہروں کو پیشہ ورانہ نمائش کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کے اسی قسم کے مظاہروں کو قربانی کے پُرفخر نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسان کا حقیقی کمال یہ ہے کہ وہ خودنمائی کے شوق سے اوپر اٹھ جائے۔ اگر چہ تمام کاموں میں انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام یہی ہے۔

جب دلدل میں پھنس جائیں

1909ء میں میرا تعلق ریاست باؤنی کدورہ (بندیل کھنڈ) سے ہو گیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہدِ حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں مودھا (ضلع ہمیر پور) کے تھانہ میں مامور تھے۔ اور میں ہر پندرہویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا۔ میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دُور تھی۔ تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہو گیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور مودھا جانے کے لیے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے۔ میں ریت کے اس حصے کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا، تا کہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ ریتیلا حصہ ہے، جو بظاہر صاف اور مسطح نظر آتا ہے۔ لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس کے نیچے دلدل ہو جاتی ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی، اس لیے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا۔ اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دُور چل کر مجھے ایک ریتیلی تنگنا رے ملی۔ اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تا کہ وہ اسے پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز کا سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی، لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا۔ اور اس کے اگلے پاؤں ریتیلے حصے کے اندر ہی رہے۔ اس

کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے)، بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پٹ ڈال دیا جائے۔ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں، اس لیے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے الگ کر کے اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے۔ اور میں نے انہیں آواز دی۔ وہ دونوں دوڑے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں۔ اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا۔ اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیوں کر نکالا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا جائے اور اس کو بھی گھسیٹا جائے۔ میں لگام کو جھٹکا دینے لگا۔ مگر گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور آخر کار وہ دھنستے دھنستے غائب ہو گیا۔

(نیاز فتحپوری)

قدردانی

میں جس زمانہ (از ستمبر 1962ء تا جون 1963) میں مکگل یونیورسٹی (کناڈا) کے اسلامک ریسرچ اینڈ ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ سے بحیثیت معلم کے وابستہ تھا۔ اس زمانہ

میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ مئی 1963ء کے پہلے ہفتہ میں انسٹی ٹیوٹ کی گورننگ باڈی کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں میں بھی شریک تھا اور پروفیسر ولفریڈ کنیٹول اسمتھ (Wilfred Cantwell Smith, 1916-2000) انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس میں صدرنشین تھے۔ ایجنڈے پر بہت سے تعلیمی مسائل کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک طالب علم مسٹر مشیر الحق (حالیہ پروفیسر شعبۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ) ایم اے (M.A.) کا امتحان دے چکے تھے اور اب وہ پی ایچ ڈی (PhD) میں داخلہ چاہتے تھے۔ میٹنگ میں جب یہ مسئلہ زیر غور آیا تو پروفیسر اسمتھ نے کہا کہ مشیر ایم اے کے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں گے اور اس بنا پر پی ایچ ڈی میں داخلہ اور اس کے اسکالرشپ کے مستحق ہوں گے ہی، لیکن اس سلسلہ میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ مشیر شادی شدہ ہیں، اور ان کے بچے بھی ہیں اور مشیر کو ان سے جدا ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔ اب اگر یہ پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب مزید تین برس اور یہ اپنی بیوی بچوں سے جدا رہیں گے اور یہ ایک جوان میاں بیوی کے لیے نامناسب بات ہے۔ اس بنا پر میں دو تجویزیں پیش کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ مشیر کے لیے ہندستان آنے جانے کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ موسم گرما کی تعطیل کے تین مہینے اپنے بچوں میں گزار لیں، اور دوسری تجویز یہ ہے کہ ان کی بیوی اور بچوں کو یہاں بلوا دیا جائے، اور ان کے اسکالرشپ کی رقم میں اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ سب مل کر آسانی سے گزارہ کر لیں۔ کچھ دیر بحث و گفتگو کے بعد اسمتھ صاحب کی دونوں تجویزوں کو علی سبیل التبادل نہیں بلکہ علی سبیل الاجتماع منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ مشیر صاحب ہندستان آئے۔ تین مہینے کے قریب یہاں رہے اور پھر اپنی بیوی بچوں کو لے کر کناڈا واپس لوٹ گئے۔

(مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پیدائش 1908ء، ہمدرد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد، نئی دہلی)

اعتراف

غالباً 1930ء کا واقعہ ہے۔ جارج اسلامیہ ہائی اسکول، گورکھ پور (جو بعد کو اسلامیہ کالج بنا) کے ایک استاد مسٹر شرف الدین تھے۔ بہت ذہین اور لائق استاد تھے۔ انگریز انسپکٹر ایک روز ان کی کلاس کا معائنہ کرنے کے لیے آیا۔ اس وقت وہ غالباً نویں کلاس کو انگریزی زبان پڑھا رہے تھے۔ انگریز انسپکٹر ان کی کلاس میں بیٹھ گیا اور ان کے درس کو سنتا رہا۔ بعد کو اس نے انسپکشن رپورٹ میں لکھا:

I did not inspect the class of Mr. Sharfuddin. actuaily
I attended it. He is so learned a teacher.

میں نے مسٹر شرف الدین کی کلاس کا معائنہ نہیں کیا۔ بلکہ حقیقتاً ان کے کلاس میں شرکت کی۔ وہ واقعی ایک لائق استاد ہیں۔

(ڈاکٹر محمود قادری، پیدائش 1914ء، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی 110006)

غلطی کا اعتراف

1941ء کے شروع کا واقعہ ہے۔ میں فوجی دفتر کی ایک شاخ (اے جز برانچ) کے سیکشن (اے جی نمبر 11) واقع نئی دہلی میں ملازم تھا۔ میرے ایک ساتھی عالم چند سنگھ تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر دفتر کی ایک فائل اس وقت کے ہمارے سیکشن کے انچارج افسر کے پاس کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے بھیجی۔ یہ ایک انگریز کرنل تھا، جس کا نام اب مجھے یاد نہیں۔ اس افسر نے فائل دیکھی تو اس کو ایک کاغذ نظر نہیں آیا، جس کی اسے خاص ضرورت تھی۔ اس نے نہایت ناراضگی کے لہجہ میں یہ نوٹ لکھ کر فائل کو اپنے ماتحت مسٹر عالم چند سنگھ کے پاس بھیجا کہ فلاں کاغذ اس میں کیوں نہیں ہے۔

عالم چند سنگھ نے فائل کو غور سے دیکھا تو اس میں مطلوبہ کاغذ موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے فائل کو دوبارہ اپنے انگریز افسر کے پاس بھیجا اور لکھا کہ جناب فائل کے فلاں صفحہ کو ملاحظہ فرمائیں جس میں مطلوبہ کاغذ موجود ہے۔

افسر نے دوبارہ فائل کا جائزہ لیا تو کاغذ اس کے اندر موجود تھا۔ اس کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے فائل پر موٹی سرخ پنسل سے اپنے سابقہ نوٹ کے ساتھ لکھ دیا — میں اس وقت اندھا تھا:

I was blind then

(حاجی اختر محمد خاں، پیدائش 1915، محلہ کوٹ، بگراسی، ضلع بلند شہر)

زندہ انسان

ایسے زندہ انسان ہمارے اندر کیوں نہیں

ہندستانی انجینئر غیر ضروری تعمیرات اور غیر ضروری ڈزائنوں پر کروروں روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے مسٹر کے ڈی مالویہ (سابق وزیر پٹرولیم) نے بتایا کہ مشرقی ہندستان میں ایک پل پر کام ہو رہا تھا۔ اس دوران ڈرلنگ مشین کو پل پر لے جانے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت موقع پر دو انجینئر تھے۔ ایک روسی اور دوسرا ہندستانی۔ ہندستانی انجینئر نے کہا کہ ڈرل کرنے کی بھاری مشین پل کے اوپر لے جائی گئی تو پل ٹوٹ کر گر جائے گا۔ اس لیے مشین اس وقت تک پل پر نہ چڑھائی جائے جب تک اس کے استحکام کا مزید انتظام نہ کر لیا جائے۔

روسی انجینئر کو اس سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈرلنگ مشین کو ہم پل پر لے جا سکتے ہیں اور اس سے پل کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بحث بڑھی یہاں تک کہ یہ مسئلہ متعلقہ

وزیر تک پہنچا۔ روسی انجینئر نے اپنے نقطہ نظر کی وکالت کرتے ہوئے وزیر سے کہا: ''روس میں میری بیوی اور بچے ہیں، اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ مگر میں اس کے لیے تیار ہوں کہ پل کے نیچے کھڑا ہو جاؤں جب کہ مشین پل کے اوپر چڑھائی جائے''۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے روسی انجینئر نے فی الواقع ایسا ہی کیا اور بے ضرر بچ کر نکل آیا۔

(کے سی کھنا، مطبوعہ السٹریٹڈ ویکلی، 21 ستمبر 1975)

ارادہ بیماری پر غالب آیا

کلاس میں صحت کی بات چھڑ گئی۔ ماسٹر صاحب صحت کے اصول لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک طالب علم کھڑا ہو گیا۔ ''ماسٹر صاحب'' وہ بولا ''اجازت ہو تو ایک بات دریافت کروں''۔

''ضرور''

''ماسٹر صاحب اس عمر میں آپ کی اتنی اچھی صحت ہے، اس کا راز کیا ہے''۔

اس کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔ انھوں نے کہا ''یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میں تم سے بھی چھوٹا تھا، اس وقت میں کلکتہ میں تھا، میری صحت بہت خراب ہو گئی، میں اتنا دُبلا اور کمزور ہو گیا۔ کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر بھی میرے علاج سے مایوس ہو گئے۔ ایک روز ڈاکٹر نے کہا ''اس کو گھر لے جاؤ۔ اب یہ بچ نہیں سکتا، تا کہ یہ مرے تو اپنے ماں باپ کے پاس مرے''۔

''ڈاکٹر کو میری موت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے میرے سامنے ہی یہ بات کہہ دی۔ مجھے ڈاکٹر کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا ''مجھے زندہ رہنا ہے''۔ اور میں نے اس کے فوراً بعد زندگی کی جدو جہد شروع کر دی۔

”میں نے سوچا کہ سب سے پہلا کام مجھے یہ کرنا ہے کہ اپنے دماغ سے اس خیال کو نکال دوں کہ میں بیمار ہوں یا مر جانے والا ہوں ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو مجھے بہر حال جینا ہے ۔اس کے بعد نہ میں کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اور نہ کوئی دوا کھائی ۔البتہ اپنی زندگی کو نہایت منظم کرلیا۔ میں روزانہ صبح کو کھلی ہوا میں ورزش کرتا، روزانہ نہاتا، روزانہ اپنے بدن پر تیل کی مالش کرتا اور دن رات کے سارے اوقات کو ایک نظام کے تحت گزارتا۔

میرا ارادہ میری بیماری پر غالب آیا۔ میں دھیرے دھیرے اچھا ہونے لگا۔ میرے چہرے پر موت کے پیلے پن کے بجائے زندگی کی سُرخی دوڑنے لگی ۔ اب میں ایک تندرست نوجوان تھا، جس کی صحت پر لوگ رشک کرتے تھے ۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں بچپن سے جوان ہوا اور جوانی کے بعد اب بڑھاپے کا دور شروع ہو گیا ہے، لیکن ڈاکٹر کے اندازہ کے خلاف نہ صرف یہ کہ میں زندہ رہا بلکہ پھر کبھی بیمار نہیں ہوا۔

میں نے طے کیا تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے اور قدرت نے یہ الفاظ صحیح ثابت کردکھائے“۔

درخواست کے بغیر

ڈاکٹر پی ایل بھٹنا گر (1976-1912) نے 1933ء میں ایم ایس سی میں ٹاپ کیا تو گھر والوں کی بہترین تمنا یہ تھی کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں بیٹھیں ۔ اس وقت ممتاز طالب علموں کے لیے سب سے زیادہ پر کشش چیز یہی تھی ۔مگر ڈاکٹر بھٹنا گر کے علمی شوق نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آئی سی ایس افسر بننے کے بجائے ٹیچر اور اسکالر بننے کو ترجیح دیں۔

1956ء کا واقعہ ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر (1969-1906) وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے ۔ ان کو ایک ایسے قابل ریاضی داں کی تلاش تھی جس کو انڈین انسٹی آف

سائنس، بنگلور میں اپلائیڈ میتھ میٹکس (Applied Mathematics) کے شعبہ کا صدر بنایا جا سکے۔ انٹرویو کے لیے سلکشن کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر خود ہمایوں کبیر تھے۔ کمیٹی کو درخواست دہندگان میں کوئی بھی شخص عہدہ کے لائق نہ ملا۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے پروفیسر ڈی ایس کوٹھاری سے کہا جو کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر بھی تھے: "کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس عہدہ پر بیٹھنے کے لائق ہو"۔ کوٹھاری نے کہا: "کم از کم ایک شخص تو مجھے معلوم ہے، اور وہ ڈاکٹر بھٹنا گر ہیں"۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً ڈاکٹر بھٹنا گر کے نام اپائنٹمنٹ لیٹر بھیج دیا۔ اگرچہ موصوف نے اس عہدہ کے لیے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔

ڈاکٹر بھٹنا گر نے ٹیچر کے مقابلہ میں صدر بننے کی پیش کش کو بجبر قبول کیا تھا۔ تاہم وہ ان کے لیے مزید عہدوں کا زینہ بنا۔ وائس چانسلر راجستھان یونیورسٹی اور جے پور یونیورسٹی، ممبر یونین پبلک سروس کمیشن۔ 1968 میں ان کو پدم بھوشن کا خطاب دیا گیا۔ یہ تقریب ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں انجام پائی تھی، جو اس وقت صدر جمہوریہ ہند تھے۔

حکمت عملی

ایک خاندان کے یہاں دوسرے فرقہ کا ایک آدمی ملازم تھا۔ اس نے چوری کی۔ نوجوان صاحبزادے جوش میں اس کو مارنے کے لیے دوڑے۔ باپ نے منع کیا۔ "تم چوری کے لیے اس کو مارو گے"، باپ نے کہا "اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ، فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ، کھڑا ہو جائے گا"۔ اب گھر کے لوگ مارنے سے رک گئے اور مسئلہ کو حکمت کے ساتھ حل کیا۔

"حکمت عملی'' کا یہ راز جو ایک معمولی آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں پالیتا ہے، اس کو پاکستان کے رہنما اسلامی تحریک کے معاملہ میں نہ جان سکے۔ وہ صورت حال کے تمام پہلوؤں کا اندازہ کیے بغیر بار بار ایسے اقدامات کر رہے ہیں کہ اصل مقصد (اسلامی نظام کا قیام) تو حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ ہنگامہ کے نتیجہ میں کچھ دوسرے شدید تر مسئلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نئی نئی پیچیدگیاں ابھر کر راستہ کی مشکلات کو کچھ اور زیادہ بڑھا دیتی ہیں—مجیب ازم (بنگالیت)، بھٹوازم (پاکستانی نیشنلزم)، ولی ازم (سرحدی علاقائیت) وغیرہ، سب اسی قسم کے نادان اقدامات کے پیدا شدہ نتائج ہیں۔ "چوری" ختم نہیں ہوتی۔ البتہ "فرقہ وارانہ فسادات" نئے نئے عنوان سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیسی عجیب ہے یہ سیاست اور کیسے عجیب ہیں یہ خادمانِ اسلام۔

لڑائی ختم ہوگئی

جون 1965 کا واقعہ ہے۔ میں نینی تال کے ایک اسکول میں فزکس کا استاد تھا۔ ایک لڑکا میرے پاس ٹیوشن کے طور پر پڑھنے آتا تھا۔ اس کا نام وزیر سنگھ تھا۔ عمر تقریباً سترہ سال تھی۔ ایک روز وہ کسی قدر دیر سے آیا۔ حال یہ تھا کہ قمیص پھٹی ہوئی، ہونٹوں سے خون جاری، بال بکھرے ہوئے۔ اس کا یہ حلیہ دیکھ کر میں نے خیریت دریافت کی۔

اس نے بتایا کہ وہ آرہا تھا کہ راستہ میں ایک مقام پر ایک رکشہ والے سے اس کا ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے بعد لڑکے میں اور رکشے والے میں تو تو میں میں ہوئی اور دونوں لڑ گئے۔ رکشے والا سردار تھا اور اپنے روایتی حلیہ میں تھا۔ مگر لڑکا بے داڑھی مونچھ اور بغیر پگڑی تھا۔ بظاہر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ سردار ہے۔

لڑائی میں رکشے والے نے لڑکے کو پٹک دیا۔ اور مارنے لگا۔ اتنے میں لڑکے نے پنجابی زبان میں رکشے والے کو برا بھلا کہا۔ یہ سن کر رکشے والا ٹھٹھک گیا۔ اس نے پوچھا:

"تم کون ہو، تمھارا نام کیا ہے"۔

"وزیر سنگھ"۔

" کیا تم سردار ہو"۔

"ہاں"۔

اس کے بعد رکشے والا فوراً اٹھ گیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا، سردار سردار کو نہیں مارتا"۔ اس نے کہا اور دونوں گرد جھاڑتے ہوئے اپنے اپنے راستہ پر چلے گئے۔

(سید حیدر علی، ایم ایس سی، پیدائش 1944ء، دہلی)

کمزور طاقت ور کے اوپر غالب آسکتا ہے

یہ قوی ہیکل جوان امریکی ہوائیہ کا ایک افسر ہے جس کا نام میجر رچرڈ اڈگر جانسن ہے۔ دسمبر 1973 میں شمالی ویٹ نام کی ایک معمولی عورت نے اس کو پکڑا اور اس کو بندوق کی نوک پر اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر دیا۔

US Air Force Maj. Richard Edgar Johnson, a B-52 pilot, was captured by North Vietnamese militia women in Kim Anb District. Vinh Phu Province of North Vietnam.

جھکنے میں سر بلندی

فرد کا جھکنا قوم کا سر بلند ہونا ہے

لارڈ سالسبری (1830-1903) ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ حکومت میں برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس زمانہ میں کار کا رواج نہ تھا۔ وزیر اعظم سالسبری اپنی سائیکل پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ ایک مقام پر وہ سڑک کے غلط رخ سے گزرنے لگے۔ سڑک پر متعین کانسٹبل نے انھیں روکا۔ وزیر اعظم نے کانسٹبل کو بتایا کہ میں وزیر اعظم ہوں، اور چوں کہ مجھے عجلت تھی اس لیے مجھ سے ٹریفک کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہوگئی۔ کانسٹبل نے جواب دیا کہ میں اپنی ڈیوٹی کو بجالانے والا کانسٹبل ہوں۔ میرا فرض صرف یہ ہے کہ ٹریفک کی خلاف ورزی نہ ہونے دوں۔ چوں کہ آپ ایک سفید ریش بزرگ ہیں، اس لیے میں صرف اتنی رعایت کرسکتا ہوں کہ آپ کا چالان نہ کروں۔ لیکن اتنا آپ کو بہر حال کرنا پڑے گا کہ آپ واپس جائیں اور جہاں سے سڑک شروع ہوتی ہے، وہاں سے سیدھی سمت میں آئیں۔ وزیر اعظم نے بے چون وچرا ٹریفک کانسٹبل کا حکم مان لیا۔ نیز اس واقعہ کا ذکر ملکہ وکٹوریہ کے پرائیویٹ سکریٹری سے خود کر کے اس فرض شناس کانسٹبل کو خراج تحسین پیش کیا۔

برطانیہ کے دوسرے وزیر اعظم مسٹر بالڈون (1867-1947ء) کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی کار میں سفر کر رہے تھے۔ ایک چوراہہ پر کار رکی۔ ٹریفک کی قطار میں ان کی گاڑی پیچھے تھی۔ راستہ کھلا تو ڈرائیور نے قبل اس کے کہ آگے کی موٹریں گزریں، وزیر اعظم کی موٹر آگے نکال لینے کی کوشش کی۔ ٹریفک کانسٹبل نے فی الفور روکا۔ ڈرائیور نے کہا کہ وزیر اعظم صاحب کو سرکاری کام کی وجہ سے جلدی ہے۔ کانسٹبل نے کہا، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ موٹر نشین کون ہے۔ قانون کی رو سے ٹریفک کی پابندی عام شہری اور وزیر اعظم دونوں پر لازم ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم نے موٹر سے اتر کر کانسٹبل سے معافی مانگی اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کانسٹبل کے حکم کی تعمیل کرے۔ (نیشنل ہیرلڈ، جنوری 1978)

لیڈر اپنے کو اصول کے آگے جھکا لے تو ساری قوم اصول کے آگے جھکنے والی بن جاتی ہے، اور یہی کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا راز ہے۔

سیاست کا راز

ابو فراس حمدانی (968-932ء) عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

إِذَا مَا أَرْسَلَ الأُمَرَاءُ جَيْشًا إِلَى الأَعْدَاءِ أَرسَلْنَا كِتَابًا

یعنی ہماری دھاک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لیے لشکر بھیجنا پڑتا ہے، وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

یہاں ایک شعر میں شاعر نے سیاست کا راز بتا دیا ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے لڑائی بھڑائی جاری رکھی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنالیا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو صرف ایک "تحریر" بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہو۔

کام میں انہماک

سر جادو ناتھ سرکار (1958-1870ء) کو مغل تاریخ کا کولمبس کہا جاتا ہے۔ یہ مقام انھیں کس غیر معمولی انہماک کے ذریعہ ملا، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر رگھو بیر سنہہ کو اپنی عمر کے آخری 27 برسوں میں لکھے۔ 80 برس کی عمر کو پہنچ کر بھی ان کے اندر کام کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کلکتہ میں

اپنے وسیع مکان کو چھوڑ کر وہ صرف اس لیے کامشیت چلے گئے کہ کلکتہ کے ناموافق موسم کی وجہ سے وہ وہاں پوری طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ منتخب 329 خطوط جس زمانہ (1932-1958ء) سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں ملک کے اندر اور باہر زبردست واقعات ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم، ہندستان کی آزادی، مہاتما گاندھی کا قتل، وغیرہ۔ مگر خطوط میں ان واقعات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تاہم دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کی خبر انھیں متاثر کرتی ہے۔ 28 جون 1945 کو وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"اگر تم اپنے لندن کے فوٹو گرافر کو خط لکھو تو اس کو ہدایت کرو کہ وہ برٹش میوزیم کے (فلاں) مخطوطہ کی فوٹو اسٹٹ کاپی لے لے۔ یورپ میں امن قائم ہو جانے کی وجہ سے برٹش میوزیم نے اپنے مخطوطات کے ذخیرہ کو شاید دوبارہ نکال لیا ہو جو (جنگ کے زمانہ میں) تہ خانوں میں رکھ دیے گئے تھے"۔

لطیفہ

"دیکھو ترکیب استعمال سمجھ لو"— حکیم صاحب نے مریض کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ارشاد ہو"۔

"اس کو گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر، چھان کر سوتے وقت پی لینا۔ اللہ نے چاہا تو پہلی ہی خوراک میں آرام محسوس ہوگا"۔

"بہت اچھا حضور"۔

"اور دیکھو کل صبح آ کر اطلاع دینا"۔

"بہت اچھا"۔

دوسری صبح مریض پھر آیا، حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، کہو کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا "نہیں حضور کچھ فرق نہیں بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے"۔ حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے، ماتھے پر ہاتھ رکھا، لمبی سانس لی اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ۔

"نسخہ؟" مریض بولا "حضور نسخہ تو آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے جوش دے کر پی لیا"۔

حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں "کیا کہا! نسخہ پی لیا"

"جی حضور، نسخہ جوش دے کر پی لیا جیسا کہ آپ نے بتایا تھا کہ اس کو..."

"ارے بدبخت"، حکیم صاحب غصہ سے بولے " کہیں نسخہ بھی جوش دے کر پیا جاتا ہے، نسخہ میں جو دوا لکھی جاتی ہے وہ استعمال کی جاتی ہے، نہ کہ نسخہ کا کاغذ"۔

وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے ہیں

ڈاکٹر آر پی ترپاٹھی مغل تاریخ پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ہسٹری آف دی مغلس نے اپنے موضوع پر غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آج کل وہ لندن کے قریب اسکس میں مقیم ہیں اور اسلام پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ 86 سال کی عمر کے باوجود وہ چار سال سے ہر روز کم از کم سات مکمل گھنٹے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں، تاکہ اس عظیم مذہب کے بارے میں اپنی کتاب کے لیے مواد جمع کر سکیں۔

ڈاکٹر ترپاٹھی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی، جہاں ان کے والد سرکاری ملازمت میں تھے۔ بنارس یونیورسٹی سے انھوں نے ایم اے کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ مل گئی۔ اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک انگریز افسر نے اتفاقاً ان کا لکچر سنا۔ اس

لکچر سے وہ متاثر ہوا، اور اس نے اس کا اعتراف اس طرح کیا کہ لندن کے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز میں ان کو اسکالرشپ دلوادی۔ یہ 1916ء کا واقعہ ہے۔ مگر جب وہ لندن پہنچے تو اسکول کے پرنسپل نے کہا کہ میں آپ کو براہ راست ریسرچ میں داخلہ نہیں دے سکتا۔ پہلے آپ کو ہمارے یہاں سے ایم اے کا امتحان پاس کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر ترپاٹھی کو پرنسپل کی بات پسند نہیں آئی۔ وہ مشہور پروفیسر لاسکی سے ملے اور ان کو ساری بات بتائی۔ پروفیسر لاسکی نے کہا کہ آپ کسی بھی اپنے پسندیدہ موضوع پر ایک مضمون لکھ کر مجھ کو دکھائیے۔ انھوں نے مغل ایڈمنسٹریشن پر دس صفحات کا ایک مضمون لکھ کر پیش کیا۔ پروفیسر لاسکی کو وہ مضمون پسند آ گیا۔ انھوں نے ان کے اسی مضمون پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیدی۔ اور پھر لندن اسکول آف اکنامکس میں ان کو ریڈر کی جگہ دلوادی جو اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ 20 سال تک اس اسکول میں ریڈر اور پھر پروفیسر رہے۔

Dr, R.P. Tripathi, Hornchurch Essex, England

توسع اور رواداری

برطانیہ کی یہودی ایکٹرس ونیسا ریڈگریو (Vannesa Regdrave, b. 1937) کو 1977 میں ہالی وڈ کا بہترین انعام ”آسکر ایوارڈ“ ملا ہے۔ مالٹا کے سفر میں ایک اخبار نویس نے اس سے سوال کیا: ”کسی فن کار کے سیاسی نظریات کس حد تک عوام کو اس کے فن کے خلاف برگشتہ کرسکتے ہیں“۔ ریڈگریو نے جواب دیا:

”میں نے ایک سامع کی حیثیت سے ویگنر (Wagner) کی موسیقی کو سننے سے اس لیے کبھی انکار نہیں کیا کہ ظالم ہٹلر اس کو بہت پسند کرتا تھا“۔

رعایت نہیں صلاحیت

ہمارے ملک کی مسلم قیادت نے مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کا جو آخری راز دریافت کیا ہے، وہ یہ کہ ”مسلمانوں کو وہ رعایتیں دی جائیں جو شیڈیولڈ کاسٹ کے لیے مخصوص کی گئی ہیں“۔ اولاً تو یہ ممکن نہیں۔ اور بالفرض یہ ناممکن اگر ممکن بھی ہو جائے تو یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی کوئی رعایت زندگی کے وسیع تر حقائق کا بدل نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا استعداد کی بنیاد پر جگہ حاصل کرنے کی دنیا ہے۔ یہاں محض رعایت سے کوئی شخص بلند مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

و نے کرپال اور گووند کیلکر نے شیڈیولڈ کاسٹ اور قبائل کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان رعایتوں نے ان طبقات کی حالت میں کوئی حقیقی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ اب بھی اگر کوئی ہریجن کامیاب ہے تو وہ وہی ہے جس نے اپنے اندر کوئی خاص صلاحیت پیدا کی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر امبیڈکر، شری جگ جیون رام، شری کے آر نارائن، وغیرہ۔

لکشمن ہلدر ایک مزدور تھے۔ پھر انھوں نے کچھ تعلیم حاصل کی اور ٹائپ کرنا سیکھا۔ اس کے بعد ان کو مرکزی حکومت میں رزرو سیٹ کے تحت کلرکی ایک جگہ مل گئی۔ مگر ان کی انگریزی کمزور تھی۔ ان کے افسر نے ان کی کتاب میں لکھ دیا:

His English is weak

اس قسم کی رپورٹ تین سال تک درج ہوتی رہی۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر تین سال تک مسلسل کسی کے خلاف ”بیڈ رپورٹ“ ہوتی رہے تو اس کی ملازمت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکشمن ہلدر کو ختم ملازمت کا نوٹس مل گیا۔ تاہم انھوں نے دوڑ دھوپ کی۔ ایک ڈائرکٹر کو ان پر رحم آ گیا اور اس نے ان کی ملازمت میں چھ ماہ کی توسیع کر دی۔ اب لکشمن ہلدر نے محنت شروع کی اور مدت ختم ہونے تک انگریزی بولنے کی اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ اس

کے بعد وہ دوبارہ ملازمت میں لے لیے گئے۔ (السٹریٹڈ ویکلی، 24 اپریل 1976)

لکشمن ہلدر کو بالآخر جس چیز نے جگہ دی وہ ان کی صلاحیت تھی، نہ کہ رعایت۔ یہی بات ہر ایک کے لیے صحیح ہے، چاہے وہ ہریجن ہو یا غیر ہریجن۔

خاموشی اختیار کرلی

1962 میں جب چین نے ہندستان پر حملہ کیا، اس وقت مسٹر وی کے کرشنا مینن (1896-1974) ہندستان کے وزیر دفاع تھے۔ اس کے بعد ''اِن سائڈ اسٹوری'' اور ''اَن ٹولڈ اسٹوری'' قسم کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں مسٹر مینن کو اس حادثہ کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اس طرح کی کتابیں اور مضامین نے اس موضوع کو لوگوں کے لیے انتہائی طور پر دلچسپی کا موضوع بنا دیا۔ کرشنا مینن اس موضوع پر ایک کتاب لکھ کر ایک ''بسٹ سیلر'' وجود میں لا سکتے تھے۔ متعدد ناشرین نے ان کو ایسی ایک کتاب کے لیے بڑی بڑی رقموں کی پیش کش کی۔ اخبارات نے اس موضوع پر مضامین لکھنے کے لیے گراں قدر معاوضے پیش کئے۔ مگر کرشنا مینن نے بالکل خاموشی اختیار کرلی۔

الفاظ جو فضا میں گم ہو گئے

مولانا محمد علی نومبر 1930ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ یہاں انھوں نے جو طوفان خیز تقریر کی، اس کے چند الفاظ یہ تھے:

''آج میں جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو ایسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ مجھے ہندستان کی آزادی نہیں دیں

گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی— ہمارے پاس 32 کروڑ آدمی ہیں جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں مرنا جانتے ہیں تو یقیناً وہ برطانوی گولی سے بھی جان دے سکتے ہیں"۔

آج ان الفاظ کو تلاش کیا جائے تو وہ تاریخ کی الماری کے سوا اور کہیں نہیں ملیں گے۔

دہرا نقصان---

"نیٹ جہاز کیا ہے" طالب علم سے یہ سوال پوچھا جائے، اور اس کے جواب میں وہ جیٹ جہاز کی تفصیلات بتانے لگے، تو امتحان کے ایک اصول کے مطابق اس کے نمبر کم کر دیے جائیں گے۔ یعنی سوال اگر پانچ نمبر کا تھا تو غلط جواب کی وجہ سے اس کے دس نمبر کاٹ لیے جائیں گے۔ کیونکہ غلط جواب اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ نہ صرف نیٹ جہاز سے ناواقف تھا بلکہ جیٹ جہاز کو بھی نہیں جانتا تھا۔ امتحان کے اس اصول کو نمبر کی نفی (minus marking) کہتے ہیں۔

بعض امتحانات میں نمبر کی نفی کا جو طریقہ رائج ہے، وہ زندگی کے معاملہ میں بھی نہایت بے رحمی کے ساتھ کار فرما ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ غلط اقدام کر بیٹھے تو صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ وہ منزل پر نہیں پہنچے گا۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منزل سے دور ہو جائے گا۔

دو سو سال بعد

آسٹریلیا کا رقبہ ہندستان کے مقابلہ میں دگنا سے بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی آبادی بمبئی اور کلکتہ کی مجموعی آبادی سے بھی کم ہے۔ 1788ء میں جب برطانیہ کے کچھ مجرموں کو بطور سزا

اس مقام پر لا کر ڈالا گیا جہاں آج سڈنی ہے، تو اس وقت یہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مایوسی اور جھنجلاہٹ میں یہ لوگ آپس میں لڑ لڑ کر مرنے لگے۔ مگر آج آسٹریلیا ایک مکمل طور پر خود کفیل براعظم ہے۔ وہ 400 کروڑ روپے کا گیہوں ہر سال برآمد کرتا ہے اور دنیا کی اون کی کل پیداوار کا چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر سے بھرپور اس ملک کے باشندوں کا معیار زندگی دنیا کے انتہائی چند ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے۔

قومی کردار

دوسری جنگ عظیم میں جب کہ برطانوی فوج کے سامنے یہ مہم تھی کہ وہ ڈنکرک میں پھنسے ہوئے پانچ لاکھ فوجیوں کو فوری طور پر نکالے۔ اس وقت کے برطانی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے قوم سے اپیل کی کہ جن لوگوں کے پاس کشتیاں اور اسٹیمر ہیں، وہ بطور خود ان کو فلاں مخصوص مقام پر پہنچا دیں۔ پوری قوم نے اس اعلان کی تعمیل اس طرح کی کہ کوئی ایک شخص بھی نہ بچا جس نے اپنی کشتی اور اسٹیمر مقررہ مقام پر نہ پہنچا دی ہو۔

ایک انسانی کمزوری

لارڈ ریتھ (1890-1971ء) بی بی سی لندن کے "فادر" کہے جاتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اور انھوں نے برطانوی عوام کے اندر غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

525 صفحات پر مشتمل ان کی ذاتی ڈائری (The Reith Diaries) شائع ہوئی ہے۔ ڈائری میں حیرت انگیز طور پر وہ ہٹلر (1889-1945ء) کے لیے شان دار کارکردگی (Magnificient Efficiency) کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے

برعکس، خود اپنے ملک کے لارڈ ونسٹن چرچل (1874-1965ء) کے لیے ان کے پاس مکار (imposter) اور خبطی (lunatic) کے الفاظ ہیں۔

اس فرق کی وجہ ہم کو خود ان کے اعتراف میں مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک انتہائی قسم کا خود پسند (self centered) آدمی ہوں۔ بہت کم ایسا ہو سکتا ہے کہ میں کسی دوسرے کے اندر بڑائی کا اعتراف کروں:

I will rarely admit greatness in others

لارڈ چرچل نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کا مقام حاصل کرلیا۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لیے لارڈ ریتھ اپنے آپ کو سب سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ چرچل کا تصور آتے ہی ان کے اندر حریفانہ نفسیات کام کرنے لگتی تھی، جبکہ ہٹلر ان کے لیے ایک غیر متعلق شخص تھا، ہٹلر کا نام ان کے اندر معاصرانہ نفسیات پیدا نہیں کرتا تھا — یہ تھی سادہ سی وجہ مذکورہ بالا فرق کی۔

میں سوچ رہا ہوں

راجہ راؤ (1908-2006ء) ایک میسوری برہمن ہیں اور ہندستان کے مشہور فلسفی ہیں۔ ہندستان میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1929ء میں وہ مزید مطالعہ کے لیے پیرس گئے۔ اور 1950ء میں پہلی بار امریکہ کا سفر کیا۔ 1973ء میں امریکہ کی ٹیکسس یونیورسٹی میں ان کو فلسفہ کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اس قیام کے دوران ایک امریکی مصنفہ الزبتھ ووہل نے ان سے مفصل انٹرویو لیا۔ الزبتھ ووہل دوبار ہندستان آچکی ہیں۔ انٹرویو کا ایک فقرہ یہ ہے:

راؤ اپنی ذہنی زندگی کی حفاظت کرنے میں بڑے مستعد ہیں۔ وہ بغیر کسی احساس ندامت کے محض اس بنا پر کسی ملاقاتی سے ملنے سے انکار کر سکتے ہیں کہ وہ "سوچ" رہے

ہیں۔اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ یہ کہنے کے لیے بھی امریکہ کی سرزمین چاہیے۔ ہندستان میں اگر کوئی ایسا کہے تو اس کو پاگل کا خطاب ملے گا یا مغرور کا۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنی ناکامی کے راز کو سمجھ لے۔

کرنے کا کام

مولانا عبد الماجد دریا بادی (1892-1977ء) کے دادا مفتی محمد مظہر کریم صاحب اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم تھے۔ 1857ء کے ہنگامہ میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتویٰ دیا۔اس پر ان کے بھی دستخط تھے۔اودھ کے دوسرے علما مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد (مؤلف علم الصیغہ) وغیرہ کے ساتھ انھیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔

قید کے زمانہ میں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ مولانا مظہر کریم صاحب نے ایک ضخیم عربی کتاب کا اردو ترجمہ کرڈالا۔ وہاں کے انگریز افسر کو اس کی خبر ملی تو اُس نے اس کو ایک "علمی کارنامہ" قرار دیا، اور اتنا خوش ہوا کہ حکومت سے ان کے حق میں پرزور سفارش کی۔ اس سفارش کے بعد اگرچہ فوری طور پر ان کی رہائی نہ ہوسکی، تاہم ان کی قید کی میعاد میں کافی کمی کردی گئی — سیاسی حریف کی حیثیت سے انگریز مولانا مظہر کریم کا دشمن تھا، علمی اور تعمیری کام کرنے والے کی حیثیت سے وہ ان کا دوست بن گیا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ ہماری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔جن میدانوں میں ہمارے لیے کام کے مواقع تھے، وہاں کام کرنے سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، اور جس میدان میں کام کا موقع نہیں ہے، وہاں ہم اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔مزید نادانی یہ کہ اس لاحاصل کام کا نام ہم نے جہاد رکھ لیا ہے۔

یہ بے اعتمادی کی فضا

یہ اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن کا واقعہ ہے۔ میں بکنگ کی کھڑکی پر اپنا ٹکٹ لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آیا۔ اس کو کسی مقام کا ٹکٹ لینا تھا جس کی قیمت پانچ چھ روپے ہوتی تھی۔ اس نے ریزگاری بکنگ کلرک کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنا ٹکٹ مانگا۔ مٹھی بھر ریزگاری (small coins) دیکھ کر کلرک بگڑ گیا۔ "روپیہ لے آؤ۔ ہم کب تک اس کو گنتے رہیں گے" اس نے کہا اور دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دیہاتی آدمی کھڑکی سے نکل کر باہر آ گیا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس سے کہا کہ یہ ریزگاری مجھ کو دے دو اور اس کے بدلے مجھ سے نوٹ لے لو۔ دیہاتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

دیہاتی نے میری پیش کش کیوں قبول نہ کی۔ اس کی وجہ بے اعتمادی ہے۔ ہم ایک ایسے سماج میں ہیں جہاں کسی کو دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ آج اگر کوئی شخص کسی پر مہربان ہوتا ہے تو صرف اپنے فائدہ کے لیے، نہ کہ حقیقتاً دوسرے کی مدد کے لیے۔ دیہاتی نے غالباً یہ سوچا کہ میرے پاس کچھ خراب نوٹ ہوں گے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ان کو دیہاتی کی ریزگاری سے بدل لینا چاہتا ہوں۔

اور ہمارے عوامی رہنما!

بیرگنج، نیپال کا ایک قصبہ ہے، جو ریاست کی مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ نیپال کے مہاراجہ اور مہارانی یہاں حفاظتی عملہ یا افسروں کے غول کے بغیر تنہا گھومتے رہے۔ ان کی

سواری ایک معمولی سائیکل رکشا تھا۔ غریب رکشے والا دن بھر کا تھکا ہوا اپنی معمولی کمائی پر افسردہ چلا جا رہا تھا کہ ایک جوڑے نے اس کو روکا، جو سڑک کے کنارے پیدل چل رہا تھا اور اس پر سوار ہو گئے۔

دونوں سواروں نے شہر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور رکشے والا ان "سیاحوں" کو خوشی خوشی قصبہ کی سیر کراتا رہا۔ اور مختلف مقامات کے بارے میں ان کو بتاتا رہا۔ آدھ گھنٹہ کی سواری کے بعد دونوں مسافر رکشے سے اتر گئے۔ رکشے والے کو اس وقت سخت حیرانی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ دونوں مسافروں نے اسکو کرایہ کے طور پر دو ہزار روپے دیے ہیں۔ مہاراجہ نیپال کے لیے یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ وہ اکثر اسی طرح بھیس بدل کر ریاست کے مختلف مقامات پر جاتے ہیں تا کہ غریب عوام کے مسائل کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

موت کے وقت توبہ

پچاس برس پہلے کی بات ہے جب کہ ساری دنیا میں یورپ کی مسیحی قوموں کا غلبہ تھا۔ قاہرہ کے ایک عیسائی مشنری مسٹر واٹسن سے ایک شخص نے پوچھا: کتنے دنوں سے آپ مسیحی تبلیغ کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ "پچاس سال سے" پادری نے جواب دیا "اتنے دنوں میں کتنے مسلمانوں نے عیسائیت کو اختیار کیا"۔ اس کا اگلا سوال تھا۔ "تقریباً ڈیڑھ سو" پادری نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی بولا:" مگر پھر بھی آپ کو خبر دار رہنے کی ضرورت ہے"۔

سوال کرنے والے کے لیے پادری کا یہ جملہ غیر متوقع تھا۔

"اس سے آپ کی کیا مراد ہے" اس نے دوبارہ پوچھا۔ اس کے بعد پادری نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

They are apt to become Christian for material motives. Then at their death they recant.

وہ مادی محرک کے تحت عیسائی ہو جاتے ہیں اور پھر موت کے وقت توبہ کر لیتے ہیں۔

Stanwood Cobb, *Security for a Failing World*, Baha't Publishing Trust, P.O.Box 19, New Delhi-1, 1971, P.91

خدا کی طرف

مارکونی (Guglielmo Marconi, 1874-1937) پہلا شخص تھا جس نے 1901ء میں بحر اٹلانٹک کے ایک طرف سے دوسری طرف ریڈیو لہریں بھیجنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کون سا ذریعہ ہے، جس نے لہروں کے اس سفر میں مدد دی ہے۔ 1924ء میں ایڈورڈ اپیلٹن (Edward Victor Appleton, 1892-1965) وغیرہ نے دریافت کیا کہ یہ زمین کی اوپری فضا میں آئنواسفیر کی موجودگی ہے جو لاسلکی پیغام رسانی کو ممکن بناتی ہے۔

تاہم یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ فضا میں آئنواسفیر کا یہ حیرت انگیز نظام کس نے قائم کر رکھا ہے — اس قسم کے سوالات کا سائنس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ساری ترقیات کے باوجود علم کی یہ بے بسی انسان کو خدا کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سلسلے کا تازہ واقعہ یہ ہے کہ چاند پر جانے والے امریکی خلا باز جیمز ارون (1930-1991) نے الحاد کا طریقہ چھوڑ کر مذہبی راستہ اختیار کر لیا ہے۔ علم کی ترقی نے انسان کے اس احساس میں صرف اضافہ کیا ہے کہ خدا کے آگے جھکنے کے سوا اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

کام کا صحیح طریقہ

شری نانک جی موٹوانی (1902-1970ء) ایک آزادی پسند ہندوستانی تھے۔ 1942ء میں ان کو نظر بندی کی سزا ہوئی۔ وہ آٹھ مہینے جیل میں رہے۔ مہاتما گاندھی، سردار

پٹیل، پنڈت نہرو، راجندر پرشاد، وغیرہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔

یہی نا نک جی موٹو انی ہیں، جنھوں نے ہندستان میں سب سے پہلے لاؤڈ اسپیکر کی صنعت قائم کی۔ انھوں نے دیکھا کہ ہندستانی لیڈروں کے جلسہ میں بہت بڑا بڑا مجمع اکٹھا ہوتا ہے۔ مگر لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی وجہ سے مقرر کی آواز پوری طرح لوگوں تک نہیں پہنچتی۔ انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلہ کا نتیجہ مشہور لاؤڈ اسپیکر شکاگو ریڈیو (Chicago Radio) تھا۔ جس سے آج سارا ہندستان واقف ہے۔

صرف اخبار نکالنا اور جلسہ کرنا کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ مختلف لوگ مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگیں۔ اس کے بغیر حقیقی ترقی نہیں ہوسکتی۔

کون کس کی جیب میں

پہلی جنگ عظیم کے بعد جس زمانہ میں خلافت تحریک کا زور تھا، علی برادران نے ملک کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ جو ان دنوں ترک موالات کی تحریک چلا رہے تھے۔ مولانا شوکت علی ان دنوں اکثر فخریہ انداز میں کہتے تھے "گاندھی جی میری جیب میں ہیں"۔ کچھ دنوں بعد سیاسی اختلافات ہوئے اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنا راستہ الگ اختیار کیا۔ مولانا محمد علی لندن میں انتقال کر گئے۔ اور مولانا شوکت علی محمد علی جناح کے ساتھ مل گئے۔ ایک بار مسلم لیگ کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا شوکت علی نے کہا: "مہاتما گاندھی کہاں ہیں جنھوں نے گول میز کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سادہ چیک دینے کے لیے تیار ہیں"۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی پرارتھنا کی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: "بڑے بھائی کو اپنی جیب دیکھنا چاہیے۔ وہ مجھ کو وہاں پائیں گے" (ریڈینس، 26 نومبر 1978)۔

کیسا عجیب

مغربی پاکستان کے سابق گورنر امیر محمد خاں (وفات 1967ء) نے یورپ میں زرعی سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ صدر ایوب (1974-1907ء) کی حکومت کے زمانہ میں پاکستان میں جو "سبز انقلاب" آیا تھا، اس کا سہرا دراصل ملک امیر محمد خاں ہی کے سر ہے، جو اس وقت پاکستان کے غذائی وزرعی کمیشن کے صدر تھے، اور بعد کو اپنی خدمات کے اعتراف میں گورنر بنا دیے گئے۔ وہ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے۔ گورنر ہاؤس میں نماز روزہ کی سختی سے پابندی کرتے اور ان کے گھر کی خواتین ہمیشہ پردہ کے اندر رہتیں۔

جب پاکستان کے تیسرے منصوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے 30 کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ صدر ایوب نے جھنجھلا کر کہہ دیا کہ اگر آبادی کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک وقت وہ آئے گا جب اناج کی کمی کی وجہ سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو بھون کر کھائے گا۔ خوشی صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت میں زندہ نہیں رہوں گا۔

ملک امیر محمد خاں نے ستمبر 1966ء میں گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنے آبائی وطن کالا باغ چلے گئے۔ جہاں ان کے کھیت اور باغات تھے۔ یہاں ان کے گھر پر جائداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ بالآخر ایک روز وہ خود اپنے بیٹے ملک محمد اسد خاں کے خلاف رائفل لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے پر گولی چلائی، مگر وہ کندھے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ اب بیٹے کی باری تھی۔ اس نے چھ گولیاں اپنے باپ کے جسم میں اتار دیں۔ اور وہ وہیں موقع پر ختم ہو گئے۔

وہ شخص جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو قتل قرار دے کر گورنری کے عہدہ کو چھوڑ دیا تھا، بالآخر خود اپنے بیٹے کے خلاف بندوق لے کر کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ اس مقابلہ میں جوان بیٹا بوڑھے باپ پر غالب آیا اور نتیجہ برعکس شکل میں برآمد ہوا۔

توہم پرستی کہاں تک لے جاتی ہے

اہل کارتھیج اور رومیوں کی مشہور جنگ میں جب کارتھیج (Carthage) کے باشندوں کو شکست ہوئی تو انھوں نے سمجھا یہ اس غلطی کا نتیجہ ہے جو مولوک (Moloch) دیوتا کی عبادت کے سلسلہ میں ان سے ہوتی رہی ہے۔ یہ دیوتا ان کے عقیدے کے مطابق ان کے اشراف کے لڑکوں کی قربانی پسند کرتا تھا۔ مگر کارتھیج کے اعلیٰ خاندانوں نے اپنے لڑکوں کو بچانے کے لیے کئی سال یہ کیا کہ وہ قربانی کے دن چپکے سے کسی معمولی لڑکے کو پکڑ کر اس کو قربان کر دیتے تھے۔ جب انھیں شکست ہوئی تو انھوں نے سمجھا کہ ان کی اس بدعنوانی کی وجہ سے دیوتا ناراض ہو گیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ خاندان کے کئی لڑکے مقدس آگ میں جھونک دیے گئے۔

خودرا فضیحت دیگراں را نصیحت

ڈاکٹر محمد اقبال (1938-1877ء) کے پاس ایک بزرگ وراثت کے معاملہ میں قانونی مشورہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب داڑھی نہیں رکھتے تھے، وہ اکثر داڑھی کی اہمیت پر وعظ کہتے۔ آخر ایک دن ڈاکٹر اقبال نے کہا: آپ کی وعظ وتلقین کا میرے اوپر بہت اثر ہوا ہے۔ اب میں نے طے کیا ہے کہ آپ سے ایک معاہدہ کروں۔ جس طرح داڑھی نہ رکھنا ایک شرعی کوتاہی ہے، اپنی بہن کو وراثت سے محروم کرنا بھی اسی طرح شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ پہلے گناہ میں میں مبتلا ہوں تو دوسرے میں آپ مبتلا ہیں۔ آئیے طے کیجیے۔ آج سے میں داڑھی رکھ لیتا ہوں اور آپ اپنی بہن کا وراثتی حصہ دے دیں۔ بزرگ اس معاہدہ کے لیے تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے نہ اپنی بہن کو وراثت کا حصہ دیا اور نہ ڈاکٹر اقبال کے چہرہ پر داڑھی اگ سکی۔

آدمی کو اپنی غلطیوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ البتہ وہ دوسرے کی غلطیوں سے خوب باخبر ہوتا ہے۔ حالاں کہ آدمی کو جو چیز سب سے زیادہ جاننا چاہیے وہ خود اپنی غلطی ہے۔ کیوں کہ اپنی غلطیوں کا جاننا ہی آخرت میں کسی کے کام آئے گا، نہ کہ دوسروں کی غلطیوں کو جاننا۔

ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی

ایک شخص نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ خوب تندرست اور سرگرم دکھائی دیتا تھا۔ ”آپ کی صحت کا راز کیا ہے“۔ اس نے پوچھا۔ دیہاتی کا جواب یہ تھا:

”میرے من میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں تو میں ہمیشہ نہ کھاؤں کو ترجیح دیتا ہوں“۔

یہ بات جو ایک دیہاتی اَن پڑھ نے بتائی، یہی بات سقراط نے ان لفظوں میں کہی تھی:

”اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک تم بھوک سے بے تاب نہ ہو جاؤ“۔

غذا ہی میں انسان کی طاقت ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ غذا ہی آدمی کی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ غلط خوراک یا ناقص خوراک جتنی مضر ہے، اتنی ہی مضر یہ بات بھی ہے کہ آدمی بھوک کے بغیر کھائے یا ضرورت سے زیادہ اپنے پیٹ کو بھرے۔ صحت کا راز ایک لفظ میں صرف یہ ہے: ”صحیح خوراک معتدل مقدار میں“۔

اگر آدمی صرف اس ایک اصول کو پوری طرح پکڑ لے تو اس کو زندگی بھر ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہر شعبہ میں کام کی ضرورت

جنوب مغربی سمت سے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کرنا اب تک بہت مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اگست 1975ء میں پہلی بار اس کو ایک برطانوی ٹیم نے سر کیا جس کے قائد کِرس بوننگٹن (Christian John Storey Bonington, b.1934) تھے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی ٹیم کی اس کامیابی کا اہم سبب ایک برطانوی فرم کی ایک ایجاد تھی۔ اس نے بہت ہلکے وزن کے آکسیجن سلنڈر بنائے۔ ان سلنڈروں کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ ایک سو لیٹر آکسیجن ایک ایسے سلنڈر میں رکھا جا سکے جس کا وزن صرف 314 کیلو گرام ہو۔ یعنی تقریباً نہیں کے برابر۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی زندگی میں کس طرح ایک شعبہ میں کچھ لوگوں کے آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے شعبوں میں کچھ دوسرے لوگ آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ جس قوم میں سارے لوگ صرف تقریر و تحریر کا کمال دکھانے لگیں، وہ کبھی ترقی کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔

ادبی استدلال کافی نہیں

ملک خدا بخش مشہور مسلم قانون داں گزرے ہیں۔ وہ انگریزی ہندستان میں ایڈوکیٹ جنرل تھے اور 1932ء سے 1937ء تک لیجسلیٹو کونسل میں حزب مخالف کے لیڈر رہے۔ انھوں نے برطانوی صحافی بیورلی نکلس سے ایک ملاقات کے دوران بڑی شدت کے ساتھ کہا تھا:

"ہندو اردو زبان کو ہٹا کر ہندستانی کو اس کی جگہ بٹھانے کی کوشش کر رہے

ہیں۔لیکن اردو بڑی سخت جان ہے۔آپ جانتے ہیں کہ لفظ ''اردو'' کیا معنی رکھتا ہے؟ اس لفظ کے معنی ہیں لشکر۔ گویا یہ ایک لشکر ہے جس پر ہندستانی زبان کبھی فتح نہیں پاسکتی''۔(ورڈ کٹ آن انڈیا، 1944)

اس قسم کا استدلال صرف ادبی استدلال ہوتا ہے، اور ضروری نہیں کہ حقیقت واقعہ بھی ادبی استدلال کے ساتھ موافقت کرے۔

شعر وشاعری اور خطابت کے رواج نے ہماری ذہنی زندگی میں جو خرابیاں پیدا کیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خالص حقیقت پسندانہ اور سائنٹفک اندازِ فکر ہمارے یہاں پیدا نہ ہوسکا۔ کتنے عالی دماغ لوگ اس قسم کے دلائل کے بھروسہ پر صدیوں جیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کی خیالی دلیل خارجی حقیقت سے ٹکرائی تو معلوم ہوا کہ وہاں سرے سے کوئی دلیل ہی موجود نہ تھی۔

وہ صفحہ جو خالی رہا

مولانا عبد الماجد دریابادی (1892-1977ء) مولانا محمد علی (1878-1931ء) کے بارے میں فرماتے ہیں: ''میرے دوست مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بھی میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ بیتاب ہوکر تڑپ کر جوش وخروش سے للکارتے تھے: عبد الماجد اٹھو، چل کر ملحد یورپ میں تبلیغ اسلام کریں'' (صدق جدید، لکھنؤ، 2 جون 1977)۔ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938ء) نے آخر عمر میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ جس کا نام انھوں نے تجویز کیا تھا:

An Introduction to the Study of Quran

(مطالعہ قرآن کا ایک تعارف)۔ فرماتے تھے "ایک بار کتاب شروع کی تو ان شاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کے تمام نظریات توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا"۔ (شیرازہ، سری نگر، اقبال نمبر، صفحہ 66)

اس طرح کے پر جوش ارادہ کی مثالیں ہمارے یہاں بہت سی ملیں گی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے مغرب کے انسانوں کے سامنے ان کی زبان میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہو۔

بطرس بن بولس بستانی مارونی (1883-1819ء) لبنان کا ایک عیسائی عالم تھا۔ وہ عربی، سریانی، لاطینی، اطالوی، انگریزی، عبرانی، یونانی زبانیں جانتا تھا۔ فلسفہ، علم الٰہیات، قانون، تاریخ، جغرافیہ اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے امریکی عیسائیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر تورات کا ترجمہ کیا۔ المدرسۃ الوطنیہ کے نام سے ایک اسکول قائم کیا۔ یہ مدرسہ اتنا مقبول ہوا کہ شام، مصر، آستانہ، یونان اور عراق تک کے طلبہ اس میں تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ اس نے محیط المحیط کے نام سے جدید طرز کا عربی لغت لکھا۔ دائرۃ المعارف کے نام سے ایک انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی۔ چھ جلدیں شائع کر سکا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے سلیم نے ساتویں اور آٹھویں جلدیں شائع کیں۔ نویں جلد کو ترتیب دیتے ہوئے اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹوں نے نویں جلد مکمل کی۔ اس کے بعد بطرس بستانی کے بھائی سلیمان بستانی نے دسواں اور گیارھواں حصہ لکھا۔

ایک کام کو پشت در پشت آگے بڑھانے کا یہ طریقہ اس کی کامیابی کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لَا تَعْتَمِدْ عَلَى خُلُقِ رَجُلٍ حَتَّى تُجَرِّبَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ (التبر المسبوک، للغزالی، صفحہ 245)۔ یعنی کسی آدمی کے حسن اخلاق پر بھروسہ مت کرو جب تک غصہ کے وقت اس کا تجربہ نہ کرلو۔

اشتعال کے بغیر

جب غصہ دلانے والی بات کی جائے تو اس کے جواب کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی بپھر اٹھے اور ناقد پر لعن طعن کرنے لگے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ناقد کی بات کو بالکل ٹھنڈے ذہن سے سنا جائے۔ اس کی بات کے غیر متعلق پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل بات کا جواب بالکل سادہ طریقے سے دے دیا جائے۔ دونوں طریقوں میں صرف دوسرا طریقہ اسلامی طریقہ ہے۔ اس سلسلے یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

1۔ ابن عبدالبر اندلسی (م463ھ) لکھتے ہیں:

رَوَيْنَا أَنَّ طَاوُسًا وَوَهْبَ بْنَ مُنَبِّهٍ ٱلْتَقَيَا، فَقَالَ طَاوُسٌ لِوَهْبٍ: يَا أَبَا عَبْدِ ٱللّٰهِ، بَلَغَنِي عَنْكَ أَمْرٌ عَظِيمٌ. فَقَالَ: مَا هُوَ؟ قَالَ: تَقُولُ إِنَّ ٱللّٰهَ حَمَلَ قَوْمَ لُوطٍ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ. قَالَ: أَعُوذُ بِٱللّٰهِ، ثُمَّ سَكَتَ. قَالَ: فَقُلْتُ: هَلِ ٱخْتَصَمَا؟ قَالَ: لَا (جامع بیان العلم وفضلہ، جلد 2، صفحہ 95)۔ یعنی، ہم سے بیان کیا گیا کہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابوعبد اللہ، آپ کے بارے میں مجھے ایک بڑی سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا، وہ کیا۔ طاؤس نے کہا، میں نے سنا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر چڑھایا تھا۔ یہ سن کر وہب نے کہا، اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔ میں نے راوی سے پوچھا۔ کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ انھوں نے جواب دیا نہیں۔

2۔ مولانا احمد علی لاہوری کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ لاہوری نے مولانا سید حسین احمد مدنی (1957-1879ء) کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ دار العلوم دیو بند میں مولانا

مدنی کے دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ شرکاء درس میں سے کسی طالب علم کو شرارت سوجھی۔ اس نے مولانا کے پاس ایک رقعہ بھیجا اور اس کے ذریعہ تحریری طور پر یہ سوال کیا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا مدنی نے رقعہ لے کر رکھ لیا اور پہلی نشست میں کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری نشست میں جب طلبہ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا" کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے"۔

یہ سنتے ہی تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا۔ طلبہ غیظ و غضب سے بھر گئے کہ کس گستاخ نے یہ حرکت کی ہے۔ مولانا مدنی نے فرمایا" خبردار کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حق ہے کہ میں سوال کرنے والے کی تسلی کروں"۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمایا۔ "میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر سمجھ لیا جائے"۔

یہ فرضی داستانیں

مشہور ہے کہ قبل از اسلام کے عرب شاعر مہلہل تغلبی کے یہاں جب اس کی لڑکی لیلہ پیدا ہوئی تو اس نے اس کو زندہ درگور کر دینے کا حکم دے دیا۔ مگر بچی کی ماں نے اس کو چھپا دیا۔ رات کو مہلہل نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اس کو بتا رہا ہے کہ اس کی لڑکی ایک قابل لڑکا جنے گی۔ صبح ہوئی تو اس نے لڑکی کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ اس کے حکم کے مطابق زندہ دفن کر دی گئی ہے۔ مہلہل نے نہ مانا۔ اس نے مزید اصرار شروع کیا۔ آخر کار لڑکی اس کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کو عمدہ غذائیں کھلائی جائیں۔

اس لڑکی کی شادی کلثوم سے ہوئی۔ اب لڑکی اکثر خواب دیکھنے لگی کہ کوئی شخص آتا ہے اور اس کے ہونے والے بچہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتاتا ہے۔ بالآخر اس کے یہاں

ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہی وہ مشہور شاعر ہے جس کو دنیا عمرو بن کلثوم کے نام سے جانتی ہے۔

تاریخ ادب کے ناقدین اس قصہ کو من گھڑت کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قصہ عمرو بن کلثوم کی شہرت کے بعد فرضی طور پر بنا لیا گیا ہے۔ مگر اسی قسم کے، اس سے زیادہ من گھڑت قصے "بزرگوں" کے بارے میں تصنیف کر لیے گئے ہیں اور ان کو لوگ اس طرح پڑھتے اور سنتے ہیں، جیسے وہ وحی آسمانی ہو۔ جس چیز کے ساتھ تقدس کا عنصر شامل ہو جائے وہ ہر جانچ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ بالکل بے اصل کہانیوں کو لوگ اس طرح ماننے لگتے ہیں، جیسے وہ کوئی حقیقی تاریخ ہو۔

لطیفہ

شیخ سعدی شیرازی (1193-1293ء) کی عمر کا بیش تر حصہ بے سروسامان درویشوں کی طرح سفر میں گزرا۔ ایک مرتبہ دمشق میں تھے، وہاں کے لوگوں سے کسی بات پر ناراضگی ہوئی تو فلسطین کے بیابان میں چلے گئے۔ یہ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا۔ وہاں عیسائیوں نے ان کو پکڑ لیا اور طرابلس الشرق (لبنان) کے علاقہ میں خندق کھودنے کے کام پر دوسرے قیدیوں کے ساتھ لگا دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس مشقت کو برداشت کرتے رہے۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی اس طرف سے گزرا۔ وہ شیخ سعدی کو جانتا تھا۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر اس کو بہت افسوس ہوا۔ دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑایا اور اپنے ساتھ حلب لے گیا۔ وہاں عزت کے ساتھ اپنے گھر رکھا اور مزید عنایت یہ کی کہ اپنی ناکتخدا (unmarried) بیٹی سے ان کا نکاح ایک سو دینار مہر مؤجل پر کر دیا۔ مگر بیوی سخت مزاج اور تیز زبان نکلی۔ اس نے شیخ کو بے حد پریشان کر دیا۔ ایک روز طعنہ دیتے ہوئے کہا: "تم وہی ہو جس کو میرے باپ نے دس دینار میں خریدا تھا"۔ شیخ سعدی نے

فوراً جواب دیا:

"ہاں میں وہی ہوں جس کو آپ کے باپ نے دس دینار میں خریدا اور سو دینار میں آپ کے ہاتھ بیچ ڈالا"۔

الفاظ کا استعمال

ڈاکٹر پرمود کمار نے دہلی سے امراض نسواں (Gynaecology) میں خصوصی ڈگری لی اور اس کے بعد لندن (آکسفورڈ اسٹریٹ) میں اپنا مطب کھولا۔ ایک روز ایک انگریز خاتون تیزی سے ان کے مطب میں داخل ہوئی۔ "ڈاکٹر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بات کو کس طرح بیان کروں"۔ اس نے کہا اور پھر ایک وقفہ کے بعد بولی:

I think I have a touch of the sun

ڈاکٹر کمار نے اس جملہ کا مطلب یہ سمجھا کہ خاتون غالباً کسی کھلے مقام پر گئی تھیں اور وہاں ان کو تیز دھوپ لگ گئی ہے۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"، ڈاکٹر نے مریضہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ ٹھنڈے مشروبات، خاص طور پر لیموں برف کے ساتھ لیجیے اور آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی، اگر جلد پر کچھ اثر محسوس ہو تو زیتون کا تیل یا کریم مل لیجیے"۔

خاتون پریشان چہرہ پر مزید حیرانی کے اثرات لیے ہوئے باہر نکل گئی اور ڈاکٹر کمار یہ سوچنے لگے "انگریز خواتین آخر اتنی معمولی معمولی باتوں کے لیے کیوں ڈاکٹر کے پاس آتی ہیں"۔

شام کو وہ اپنی قیام گاہ پہنچے۔ وہاں مسز گلوریا، ان کی انگریز بیوی نے ان کا استقبال کیا۔ جب دونوں کھانے کی میز پر اکٹھا ہوئے تو انگریز خاتون نے دوبارہ وہی جملہ کہا، جس

کو وہ اپنے مطب میں ابھی سن آئے تھے:

Darling, I think I have a touch of the sun

ڈاکٹر کمار نے حیرانی کے ساتھ کہا: "نہیں نہیں، اس طرح تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ لندن کی خواتین ہر وقت بس سورج کی ہی بات کرتی ہیں"۔ دیر تک الفاظ کے تبادلہ کے بعد گلوریا نے محسوس کیا کہ اس کا ہندستانی شوہر اصل بات کو سمجھ نہیں رہا ہے، اس نے ہنستے ہوئے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ ہم جلد ہی تین ہونے والے ہیں"۔ انگریزی زبان میں ایک عورت اپنے حاملہ ہونے کو درجنوں طریقے سے بتا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا جملہ بھی اسی قسم کا ایک استعاراتی انداز ہے، جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "مجھے سورج چھو گیا ہے"۔

لطیفہ

مرزا غالب (1797-1869ء) جس مکان میں رہتے تھے، اس مکان میں چھت کے اوپر ایک کمرہ تھا اور اس کمرہ سے ملی ہوئی ایک تنگ و تاریک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ گرمی کے موسم میں وہ ٹھنڈی رہتی تھی۔ سخت موسم میں مرزا اسی کوٹھری میں بیٹھتے تھے۔

ایک بار رمضان کا مہینہ تھا، سہ پہر کے وقت مرزا غالب اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس کوٹھری میں بیٹھے ہوئے چوسر کھیل رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے۔ اتنے میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ وہاں آگئے۔ کوٹھری میں لہو و لعب کا منظر دیکھ کر انھوں نے مرزا سے کہا: ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3277)۔ آج اس حدیث کی صحت پر شبہ ہو گیا۔

مرزا غالب فوراً بولے: "مولانا! حدیث بالکل صحیح ہے۔ بات یہ ہے کہ شیطان جہاں قید کیا جاتا ہے، وہ یہی کوٹھری ہے"۔

لطیفہ

گاما پہلوان (1958-1874) کو 20 سال کی عمر میں "رستم ہند" اور اس کے بعد "رستم زماں" کا خطاب ملا تھا۔ ایک جلسہ ہو رہا تھا ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے۔ گاما بھی جلسہ میں موجود تھے۔ لوگ بول چکے تو آخر میں ڈاکٹر اقبال نے اعلان کر دیا کہ گاما اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ گاما پہلوان کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر انھوں نے جسم کو حرکت دی، ہاتھ ادھر ادھر لایا اور کہا "بھائیو! ورزش کیا کرو"۔

جب وہ اپنی مختصر تقریر ختم کر کے بیٹھے تو دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ گاما پہلوان کی نہ صرف پیشانی پر قطرات نمایاں تھے بلکہ کرتا بھی بھیگ چکا تھا۔

زندہ لوگ

چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیرمین اور وزیر اعظم مسٹر ہوا کوفنگ (Huq Kuo-feng, 2008-1921) کا چھوٹا لڑکا 1977ء میں کالج کے داخلہ کے ایک قومی امتحان میں فیل ہو گیا۔ داخلہ کے لیے جتنے نمبر مقرر کیے گئے تھے، وزیر اعظم کے لڑکے کا نمبر اس معیار سے کم تھا۔ اس لیے اس کا انتخاب نہ ہو سکا۔ بعد کو وزیر اعظم ہوا کے کچھ آدمیوں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا اور چاہا کہ وزیر اعظم اس مسئلہ کو دوبارہ زیر غور لائیں اور خصوصی اختیارات سے کام لے کر لڑکے کو داخلہ دلوا دیں۔ مگر وزیر اعظم نے اس معاملہ میں دخل دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اگلے سال تم زیادہ سخت محنت کرو تا کہ تم کو زیادہ نمبر ملیں اور قاعدہ کے مطابق تمھارا داخلہ ہو سکے۔ (ہندستان ٹائمس، 17 کتوبر، 1978)

اس میں سبق ہے

ہنری ہراس (1956-1889) ایک اسپینی مسیحی تھے ۔ وہ 34 سال کی عمر میں 18 نومبر 1922ء کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ہندوستان کی زمین نے انہیں متاثر کیا اور انھوں نے طے کرلیا کہ وہ اسی ملک میں رہ کر کام کریں گے۔

فادر ہراس (Fr Henry Heras) چند دن بعد سینٹ زیویرس کالج کے پرنسپل سے ملے۔ وہ ایک تاریخ داں تھے ۔ اس لیے پرنسپل نے پوچھا "آپ کون سی تاریخ پڑھانا پسند کریں گے"۔ فادر ہراس نے فی الفور جواب دیا: "ہندستانی تاریخ"۔ پرنسپل کا اگلا سوال تھا، ہندستانی تاریخ کے بارے میں آپ کا مطالعہ کیا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا" کچھ نہیں"۔ پھر آپ کیسے ہندستانی تاریخ پڑھائیں گے۔ فادر ہراس کا جواب تھا۔

I shall study it

"میں ہندستانی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو تیار کروں گا پھر اس کو پڑھاؤں گا"۔

فادر ہراس نے ہندستانی تاریخ کے مطالعہ میں اتنی زیادہ محنت کی کہ وہ سر جادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر سر بندر ناتھ سین کے درجہ کے مورخ بن گئے۔ آج بمبئی میں ان کے نام پر تاریخی مطالعہ کا ایک بہت بڑا ادارہ قائم ہے جس کا نام ہے— ہراس انسٹی ٹیوٹ۔

اس قسم کے واقعات بزرگی کا ثبوت نہیں

سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی (1975-1893ء) اردو کے شاعر تھے۔ 23 نومبر کو انھوں نے ایک غزل لکھی جس کا شعر تھا:

بسمل آیا ہے اکیلا بسمل جائے گا اکیلا

اگلے روز 23 نومبر 1975 کو ان کا انتقال ہو گیا۔

چند واقعات

1۔ اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نہایت خوبصورت اور وجیہ شخص تھا۔ ایک روز اس نے سبز جوڑا پہنا اور سبز عمامہ باندھا۔ پھر اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ کر بولا میں ایک جوان بادشاہ ہوں (أَنَا الْمَلِكُ الْفَتَى)۔ اتنے میں اس کی ایک کنیز اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیمان نے پوچھا تو کیا دیکھ رہی ہے۔ اس نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقَى

غَيْرَ أَنْ لَا بَقَاءَ لِلْإِنْسَانِ

لَيْسَ فِيمَا عَلِمْتُهُ فِيكَ عَيْبٌ

كَانَ فِي النَّاسِ غَيْرَ أَنَّكَ فَانِ

ترجمہ: تو بہترین سرمایہ ہے، کاش تجھے بقا نصیب ہوتی، مگر انسان کے لیے بقا نہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، تجھ میں کوئی عیب نہیں جو لوگوں میں پایا جاتا ہو، بجز اس کے کہ تو فانی ہے۔ (الکامل للتاریخ، جلد 4، صفحہ 94)

اس واقعہ پر ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ 10 صفر 99ھ کا ہے۔ اس نے تقریباً پونے تین سال حکومت کی اور 45 سال کی عمر پائی۔

2۔ مصر کے فرعون (Tutankhamen) کا مقبرہ 1923ء میں کھولا گیا۔ مصری علوم کے ماہر لارڈ کارناروں (Carnarvon, 1866-1923) مقبرہ کے اندر داخل ہوئے تو فوراً بیمار پڑ گئے اور چند ہفتے کے اندر مر گئے۔ اس کے کچھ دنوں بعد آرتھر میس (Arthur Mace, 1874-1928) اور جارج بینڈائٹ (George Benedite, 1857-1926) مقبرہ میں گئے، وہ دونوں بھی چند دنوں بعد اچانک مر گئے۔ یہ واقعہ جب

عوام میں مشہور ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ لوگ فرعون کی لعنت سے ہلاک ہوئے۔ (بعد کو ڈاکٹر جارج ڈین نے مقبرہ میں تین مہینے تک کام کیا۔ انھوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ ہزاروں برس سے ابابیلیں اس مقبرہ کو اپنا گھونسلا بنائے ہوئے تھیں۔ ان کی بیٹ کی بدبو سے مقبرہ بھر گیا تھا۔ مذکورہ افراد اس سخت بدبو میں سانس لینے کی وجہ سے ہلاک ہوئے)۔

3۔ کرنل اسٹافن برگ (Stauffenberg, 1907-1944) نے ہٹلر کے خلاف نہایت کامیاب منصوبہ بنایا تھا۔ جولائی 1944 میں اس نے ایک بریف کیس میں ایک ٹائم بم رکھ کر ہٹلر کے کیمپ ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیا۔ اگر بروقت یہ بم پھٹ گیا ہوتا تو برلن میں مقیم تھوڑے سے جرمن فوجی افسر ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر لیتے، اور نازی لیڈر کے خاتمہ کا اعلان کر کے جرمنی کی حکومت پر قبضہ کر لیتے۔ مگر ٹائم بم اس وقت پھٹا جب کہ ہٹلر کیمپ سے باہر آچکا تھا۔

4۔ 1947 میں کشمیر کے وزیر اعظم مسٹر مہر چند مہاجن (1889-1967ء) تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "لوکنگ بیک" (Looking Back) میں الحاق کی کہانی بتاتے ہوئے لکھا ہے: پاکستان کا ایک منصوبہ یہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو اور مجھ کو اغوا کر لیا جائے اور سنگین کی نوک پر ہم سے الحاق کے مسودہ پر جبری دستخط کرا لیے جائیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہم کو بھیم بر کے ڈاک بنگلہ میں اس وقت گرفتار کر لیا جائے جب کہ ہم وہاں لنچ کھا رہے ہوں۔ بھیم بر بالکل پاکستان کی سرحد پر ہے اور کشمیر کو جانے والی مشہور مغل روڈ پر واقع ہے۔ اس روڈ کے ایک طرف کشمیر ہے اور دوسری طرف پاکستان۔ ہم نے طے کیا تھا کہ ہم 20 اکتوبر 1947 کو کٹھوعہ کا دورہ کریں گے اور 21 کو بھیم بر اور میرپور کی طرف جائیں گے۔ پاکستان کے لوگوں نے ایک ہتھیار بند موٹر تیار کر رکھی تھی، جو 21 کو ہماری گرفتاری کے لیے بھیم بر پہنچنے والی تھی۔ مگر واقعات کی ایک غیر متوقع کروٹ نے ہم کو

بچالیا۔ 20 اکتوبر کی صبح کو جب ہم کٹھوعہ کے لیے روانہ ہوئے اور ایک چورستہ پر پہنچے، جہاں سے ایک سڑک کٹھوعہ کی طرف اور دوسری اکھنور اور بھیم بر کی طرف جاتی تھی، مہاراجہ نے اچانک جیپ ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کٹھوعہ کے بجائے گاڑی کو بھیم بر کی طرف موڑ دے۔ میں نے عرض کیا، کٹھوعہ میں سرکاری افسران اور عوام ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے اور بھیم بر کے لیے ہم نے کوئی پروگرام نہیں بھیجا ہے اور اس وقت وہاں کوئی انتظام نہیں ہوگا۔ مہاراجہ نے میری گزارش کو نظر انداز کر دیا اور کہا کہ وہ کسی پروگرام کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے ہم اکھنور اور بھیم بر کی طرف روانہ ہوئے اور میرپور نہ پہنچ سکے۔ ہم نے بھیم بر کے ڈاک بنگلہ میں دن کا کھانا کھایا اور 10 بجے رات کو جموں پہنچے۔ اس کے بعد جیسا کہ طے تھا، 21 اکتوبر کو بھیم بر کا ڈاک بنگلہ گھیر لیا گیا۔ ہم اس سازش کا شکار ہو جاتے، اگر ہم نے اصل پروگرام کے مطابق سفر کیا ہوتا۔ مہاراجہ کی پیش اندیشگی نے ہم کو پاکستان کے قبضہ میں جانے سے بچالیا"۔

Looking Back, pp. 272-273

۵۔ چین کے سابق وزیر اعظم مسٹر چواین لائی (1972-1898ء) نے اپنی موت سے صرف چند دن پہلے شمالی ویت نام کے ایک کمیونسٹ لیڈر سے اسپتال میں ملاقات کی تھی۔ دونوں کمیونزم کے بعض فکری پہلوؤں پر بحث کرتے رہے۔ جب ویت نامی لیڈر جانے لگا تو چاؤ نے ہنس کر کہا: "اب میں اس مسئلہ کو خود کارل مارکس سے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ چند ہی دن میں میں اس کے پاس جانے والا ہوں"۔ اور فی الواقع اس کے چند دن بعد 6 جنوری کی شام کو ان کا انتقال ہو گیا۔

۶۔ چنگیز خاں کے پوتے قبلائی خان (1294-1216ء) نے 1281 میں جاپان پر حملہ کیا۔ اس نے ایک عظیم جنگی بیڑہ تیار کر کے ان جزائر کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔

اس وقت جاپان ایشیا کے ایک کمزور ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔قبلائی خان جیسے فاتح کی فوج سے مقابلہ کرنے کی طاقت ان میں بالکل نہیں تھی، تاہم ان کو اپنے خداوند (آفتاب) پر بھروسہ تھا جس کی وہ اپنے آپ کو اولاد کہتے ہیں۔ جیسے ہی خطرہ کا احساس ہوا، ان کا مذہبی پیشوا اٹھا اور لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ سب لوگ دعائیں مانگو۔ انھوں نے رات دن اپنے دشمن کے مقابلہ میں اپنے خدا کو پکارنا شروع کیا۔ابھی قبلائی خان کی فوج جاپان کے ساحل پر اتری بھی نہ تھی کہ زبردست سمندری طوفان آیا اور تمام تحری بیڑہ سمندر کی ہولناک لہروں میں غرق ہو گیا۔

حقائق غالب آئے

پاکستان کے لیڈروں کا خیال تھا کہ برصغیر کے مغرب میں جب وہ مسلم حکومت قائم کر لیں گے تو پورا مغربی ایشیا اور خلیج فارس اور بحر احمر کے گرد واقع تمام ممالک جو انھیں کی طرح مذہباً مسلمان ہیں، ان کے ساتھ ہوں گے اور وہ بقیہ بھارت کے مقابلہ میں چھوٹے ہونے کے باوجود اپنے بھائیوں سے مل کر بہت بڑی حیثیت حاصل کر لیں گے۔

صدر ایوب کے زمانہ اقتدار (1969-1958ء) میں یہ امید کسی درجہ میں پوری بھی ہوئی۔مگر بہت جلد زندگی کے حقائق غالب آ گئے۔ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے یہاں پٹرول کا خزانہ برآمد ہوا۔ اب انھیں ضرورت ہوئی کہ اس دولت کے ذریعہ اپنے ملکوں میں ترقیاتی اسکیمیں چلائیں۔ ان کے پاس روپیہ بافراط تھا، مگر فنّی واقفیت (Technical Know How) کی اسی قدر کمی تھی۔ یہ دوسری چیز انھیں پاکستان نہیں دے سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندستان پچھلے سو برس کی کوششوں کے نتیجہ

میں اپنے کو اس قابل بنا چکا تھا کہ وہ مسلم ملکوں کی اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ چنانچہ ہندستان کے ماہرین کو آج مسلم ممالک میں زبردست استقبال مل رہا ہے اور پاکستان پس پشت چلا گیا ہے۔

اخباری شہنشاہ

یونسکو نے 200 قوموں کے ماس میڈیا کے بارے میں ایک سروے شائع کیا ہے۔ سروے کے مطابق اگرچہ موجودہ زمانہ میں نشر و اشاعت کے ذرائع ترقی کرکے سٹلائٹ کمیونی کیشن کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر عملاً جو صورت حال ہے وہ یہ کہ ٹیکنکل اعتبار سے چند ترقی یافتہ قومیں ہی دوسری تمام قوموں کے لیے خبر حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ 90 ملکوں میں قومی نیوز ایجنسیاں ہیں، مگر یہ ممالک بھی اپنی ملکی خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچانے کے لیے پانچ عالمی نیوز ایجنسیوں کے محتاج ہیں۔ یہ پانچ عالمی نیوز ایجنسیاں کسی ملک کی جن خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچاتی ہیں، وہ عام طور پر اس قوم کے برے پہلو اور ان کی غیر نمائندہ خصوصیات ہی ہوتی ہیں — گویا پانچ نیوز ایجنسیاں تمام اخباری دنیا کی شہنشاہ ہیں۔

انسان اور کچھوا

ہندستان میں سب سے پہلا چڑیا گھر 1875ء میں قائم ہوا۔ یہ کلکتہ کے قریب علی پور میں ہے۔ اسے کولوئی شیویںڈلر (Carl Louis Schwendler, 1803-1882) نے قائم کیا تھا۔ 1875 میں یہاں ایک کچھوا تھا جس کی عمر اس وقت 50 سال تھی۔ یہ کچھوا آج بھی علی پور زو (zoo) میں موجود ہے اور اب اس کی عمر 150 سال ہو چکی ہے۔ ایک

اخباری تصویر (ایوننگ نیوز 29 ستمبر 1975) میں ایک لڑکے کو کچھوے کے اوپر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے — انسان کچھوے کی طرح 150 سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر انسان کا ایک بچہ کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہوسکتا ہے۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا کے سیاہ فام قدیم باشندے تقریباً 25 ہزار سال پہلے اس براعظم میں آئے تھے۔ علم الانسان کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے، جب کہ آسٹریلیا، نیوگنی اور ایشیا سے ملا ہوا تھا۔ اس کے بعد آسٹریلیا کٹ کر دور چلا گیا۔ یہ قدیم باشندے اب بھی 140000 کی تعداد میں موجود ہیں۔ یعنی 1973-1972 میں آسٹریلیا کی کل آبادی (تقریباً 13268600) کا ایک فی صد حصہ۔

انسان کی زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں، وہ گویا تاریخ کی عملی کتاب کے اوراق ہیں۔ یہاں زندگی کی تمام حقیقتیں اپنے واقعاتی روپ میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ تاہم دیکھنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی کے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھا جائے۔ دوسرا دیکھنا یہ ہے کہ ان واقعات کو عبرت کی نظر سے دیکھا جائے، یعنی آدمی جو کچھ دیکھے، اس پر وہ غور کرے۔ اس کی آنکھ نے جو کچھ پایا ہے، اس کو وہ اپنے دماغ سے بھی پانے کی کوشش کرے۔ انسانی واقعات سے نصیحت لینے کے لئے عبرت کی نگاہ درکار ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو ہر دور کے انسانوں میں سب سے کم پائی گئی ہے۔

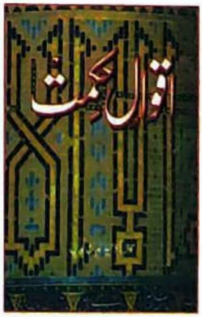

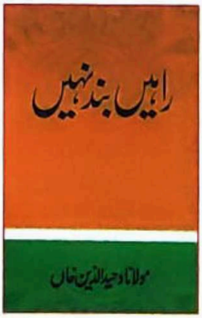

ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-831-3
9 788178 988313
₹ 25